Monthly AWAMI JAMHURIAT

عوامی جمہوریت

ماہنامہ اکتوبر/نومبر 2018

☆

اشاعت کا
50واں سال

ہاتھوں میں لے کر ہاتھ چلو۔ آؤ ہمارے ساتھ چلو

بنیادی سماجی تبدیلی کے لیے

عوامی ورکرز پارٹی

عوامی ورکرز پارٹی کے صدر فانوس گجر، زاکر حسین ایڈوکیٹ، غفران احمد ایڈوکیٹ، کاچڑہ غونڈہ کے مقام پر ایک علمی کانفرنس سے خطاب

فرنٹئر کالونی کراچی مزدور آرگنائزنگ کمیٹی کا اجتماع، اے ڈبلیو پی کے یوسف مستی خان، اختر حسین، شاہ نور، مظہر امام اور دیگر نے خطاب کیا

عوامی ورکرز پارٹی مرکزی فیڈرل کمیٹی کا دوروزہ اجلاس منعقدہ لاہور

عوامی ورکرز پارٹی ضلع سانگھڑ کے ضلعی صدر خلیل بلوچ کی زیر صدارت ضلعی پارٹی کے عہدداروں اور اراکین کا ایک اجلاس

ماھنامہ
MONTHLAY
AWAMI JAMHURIAT
LAHORE
لاھور
عوامی جمہوریت

شمارہ نمبر۔6
جلد نمبر۔14
اکتوبر/نومبر 2018
قیمت: 30روپے
CPL No 279

مذہبی انتہا پسندی اور فرقہ واریت

کیا پاکستانی ریاست کا بیانیہ بدلے گا؟

آج ایک دفعہ پھر مذہبی انتہا پسندی اور فرقہ واریت کے پاکستانی سماج اور سیاست پر اثرات زیرِ بحث ہیں اور یہ بحث اُس وقت عوام کے ہر حصے میں زوروں پر ہونے لگی جب ایک عیسائی خاتون آسیہ بی بی کے توہینِ رسالت کے مقدمے کا سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا اور عدالتِ عظمیٰ نے گواہوں کے بیانات میں تضادات اور شک کی بنیاد پر اس کو بری کر دیا اور تحریکِ لبیک پاکستان کے علماء نے کھلے طور پر سپریم کورٹ کے فیصلے کو نہ صرف ماننے سے انکار کر دیا بلکہ اس کے خلاف فتوے جاری کیے کہ جن ججوں نے یہ فیصلہ دیا ہے وہ واجب القتل ہیں اور ان کا کوئی ڈرائیور یا ملازم یہ سعادت حاصل کرسکتا ہے' ان علماء نے وزیرِاعظم کو یہودی اور چیف آف آرمی اسٹاف کو احمدی قرار دیا اور کہا کہ فوجی جرنلز ان کے خلاف بغاوت کر دیں' ان اعلانات کے ساتھ پورے ملک میں مظاہرے اور دھرنے شروع کر دیے گئے' توڑ پھوڑ اور آگ لگانے کے واقعات سے کروڑوں' اربوں کی جائیدادیں تباہ ہوئیں اور جانوں کا زیاں ہوا۔ اس تنظیم کے اعلانات اور اقدامات کے ساتھ ہی بلکہ ان کے ساتھ فرقہ واری مقابلے میں جمعیت علمائے اسلام کے مرحوم مولانا سمیع الحق' مولانا فضل الرحمٰن اور جماعت اسلامی کے سراج الحق نے بھی سپریم کورٹ کے فیصلے کی مخالفت شروع کردی۔ اب یہ اعلانات اور اقدامات پاکستانی آئین و قانون کے تحت غداری اور بغاوت کے سب سے بڑے زمرے میں آتے ہیں لیکن پاکستانی ریاست اس پر نہ صرف خاموش ہے بلکہ یہ اعلانات کرنے والوں کے ساتھ حکومت ایک مضحکہ خیز معاہدہ کرتی ہے کہ گرفتار افراد کو رہا کر دیا جائے گا اور حکومت نظر ثانی کی درخواست کی حمایت کرے گی۔ اب قانونی لحاظ سے دیکھیں تو مذہبی علماء کا ایک دوسرا نقطۂ نظر مفتی اعظم پاکستان مفتی رفیع عثمانی صاحب نے ایک کھلے خط میں بیان کیا ہے جو 11 نومبر 2018ء کے روزنامہ جنگ میں شائع ہوا ہے۔ انہوں نے شرعی قانون کے حوالے سے بات کرتے ہوئے اہم نکات اٹھائے ہیں جو علماء' فقہاء' محدثین اور ماہرین کے لیے قابل غور ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ''اسلامی اصولوں کے مطابق اگر ثبوت میں ذرا سا بھی شبہ پیدا ہو جائے تو سزا ساکت ہو جائے گی اور شبہ کا فائدہ ملزم کو جاتا ہے۔ سپریم کورٹ نے گواہوں کے بیانات میں کئی جگہ شبے نکالے جن کا فائدہ ملزم کو جانا ضروری تھا' ان کے مطابق اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ نظر ثانی میں دوبارہ غور کر لیا جائے اور اگر عدالت پھر بھی وہی فیصلہ دیتی ہے تو عدالت کا فیصلہ ماننا ضروری ہے جو شریعت کا قانون ہے۔''

اب ذرا مفتی اعظم پاکستان کے بیان اور مذکورہ بالا مذہبی رہنماؤں کے فتووں' بیانات اور عمل اور ریاست کے کردار پر غور کریں تو اس ریاست کا ہر شہری یہ پوچھنے میں حق بجانب ہے کہ مذہب کے نام پر کھلی

سرپرستِ اعلیٰ
عابد حسن منٹو
ایڈیٹر
اختر حسین
مجلس ادارت
مسلم شمیم' صباالدین صبا' توقیر چغتائی
اثر امام' عابد شکیل فاروقی
مینجنگ ایڈیٹر
اے آر عارف
سرکولیشن منیجر
اشتیاق اعظمی

لاہور آفس 5 میکلوڈ روڈ لاہور' پاکستان

اداریہ 1
بیسویں صدی کے سوشلسٹ... میر حمزہ ورک 3
فرسودہ عالمی تجارتی نظام... نجم الحسن عطا 7
پاکستانی سماج کی طبقاتی ساخت... اثر امام 10
میڈیا کی آزادی ڈاکٹر توصیف احمد خان 14
پاکستان میں طبقاتی ڈھانچہ... انجینئر حیدر زماں 15
جنگ صرف طبقاتی جنگ صباالدین صبا 19
عالمی سرمایہ دارانہ بحران.. قاضی حکیم 23
رسالہ عوامی جمہوریت شاہ محمد مری 25
کامریڈ امام علی نازش مسلم شمیم 27
ایک نظر...... عابد شکیل فاروقی 32

فون: 042-37353309-37357091
فیکس: 94-42-36361531
کراچی آفس: 201-204 پینوراما سینٹر نمبر 1 فاطمہ جناح روڈ' صدر کراچی
Email:awami.jamhuriat@gmail.com

پبلشر راجہ محمد ولایت نے پیپلز پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر 5 میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع کیا۔

بغاوت اور مجرمانہ اقدامات پر ریاستی ادارے خاموش کیوں ہیں بلکہ خود ان کے اتحادی نظر آتے ہیں اور دوسری طرف ایک اور کردار ہے جس میں اگر کوئی شہری عدالت کے حکم کی خلاف ورزی تو کجا محض کوئی نازیبا الفاظ ادا کرتا ہے تو معافی مانگنے کے باوجود بعض اوقات جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوتا ہے اور اس کثیر الاقوامی ریاست میں اگر کوئی اپنی قوم' اپنے صوبے کے معاشی وسائل پر اپنی دسترس اور اپنی لسانی' تہذیبی' ثقافتی' ومعاشی ترقی کا حق مانگتا ہے تو ریاستی قہر کا شکار ہوجاتا ہے' غائب کردیا جاتا ہے۔ پھر کئی مہینوں اور سالوں بعد اس کی لاش ملتی ہے یا زندہ لاش بنادیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی معاشرے میں عدم برداشت کے خلاف آواز اٹھاتا ہے یا محنت کش اور پسماندہ طبقات اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی کے حق کے لیے احتجاج کرتے ہیں تو ہر طرح کے نجی اور ریاستی اداروں کے ظلم و جبر کا شکار ہوتے ہیں دراصل پاکستانی سماج میں ریاست کا پہلے والا کردار یعنی مذہب کو سیاست کی بنیاد بنانا اور مذہبی قوتوں کو سماجی تبدیلی کی قوتوں کے خلاف استعمال کرنا اور اس جاگیردارانہ باقیات اور سرمایہ دارانہ سماج کو قائم رکھنے کے لیے عوامی قوتوں کو تقسیم کرنے کے لیے استعمال کرنے کا ہے اسی لیے ان مذہبی قوتوں کو نہ صرف تحفظ دیا جاتا ہے بلکہ ہر سیاسی تبدیلی میں ان کو استعمال کیا جاتا ہے اور اس نظریے کی بنیادیں ہمارے یکے بعد دیگرے حکمران طبقات کے آقا امریکی سامراج نے ہی دوسری جنگ عظیم کے بعد رکھی تھیں' جب دنیا دو متحاب معاشی کیمپس میں یعنی سرمایہ دارانہ کیمپ اور سوشلسٹ کیمپ میں تقسیم ہوگئی تھی اور سامراج کی طرف سے باقاعدہ یہ نظریہ دیا گیا تھا کہ ''سماجی تبدیلی کی قوتوں کے خلاف مذہب کو استعمال کیا جائے'' گوکہ اس سے پہلے بھی مذہب کو استعمال کیا جاتا رہا ہے مگر دوسری جنگ عظیم کے بعد باقاعدہ سامراجی پالیسی بنائی گئی اور یہ وہی زمانہ تھا جب قائداعظم کی آئین ساز اسمبلی میں 11 اگست 1947ء کی تقریر اور ایک سیکولر اور جمہوری آئین کے تصور کے خلاف 1949ء میں قرارداد مقاصد پاس کی گئی اور مذہب کو ملکی آئین کی بنیادیں بنانے کی کوششیں شروع کی گئیں اور مقامی اور بین الاقوامی سوشلسٹ تحریکات کے خلاف فوجی معاہدے کیے گئے 55-1954ء میں بغداد پیکیٹ اور سیٹو اور 1959ء میں سینٹو وجود میں آئے' پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی اور دیگر تمام جمہوری و ترقی پسند تنظیموں پر پابندی لگادی گئی اور یہی پالیسی دن بہ دن مختلف انداز میں جاری رہی۔ 1968ء میں جب ہماری فوجی جنتا کا مقصد مشرقی پاکستان کی سیاسی قیادت کے خلاف مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کو اکثریت دلوانا تھا تو مذہبی جماعتوں جنہوں نے یوم شوکتِ اسلام منا کر اپنی طاقت کا اظہار کیا تھا' ان کی طاقت کو بھی تقسیم کرنے کے لیے اس وقت کے امریکی سفیر فارلینڈ نے تمام شیوخ اور پیروں سے ملاقاتیں کرکے جمعیت علمائے پاکستان کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا جس کے پیر صاحب سیالوی شریف صدر اور رفیق سہگل جنرل سیکریٹری مقرر ہوئے ۔ مذہب کے استعمال کی بھیانک شکل جنرل ضیاالحق کا مارشل لائی دور تھا جب ملکی آئین وقوانین میں ترامیم کے ساتھ مذہبی مدرسوں کے طالبوں کو فوجی تربیت دے کے افغانستان میں وہاں کی ترقی پسند حکومت کے خلاف استعمال کیا' انہی قوتوں کو کشمیر اور دوسرے ممالک میں اپنی فوجی طاقت کے طور پر استعمال کیا گیا پھر حالیہ انتخابات میں عمران خان کو اکثریت دلوانے کے لیے تحریک لبیک پاکستان بنا کر سامنے لایا گیا لہذا ملکی اور علاقائی سیاست میں ہماری ریاست نے مذہب کے سیاست میں استعمال کو اپنا بیانیہ بنایا ہوا ہے۔

گزشتہ تقریباً 70 سال سے جاری اس بیانیے کے نتائج پر بھی کیا ہمارے حکمران غور کرنے کے لیے تیار ہیں؟ اس بیانیے نے ہی ہمیں اس خطے کے تمام ممالک کے خلاف دشمنی اور ہر وقت ہمیں اپنے تحفظ کی فکر سے لاحق کیا' ہم تنہائی کا شکار ہیں اور ایک Security state کے تصور کے طور پر زندہ ہیں ملک کے کل معاشی وسائل کا آدھے سے زیادہ حصہ دفاعی اداروں پر خرچ ہوتا ہے۔ بین الاقوامی قرض غلامی میں ہیں۔ عوام تعلیم' روزگار' صحت اور اچھی انسانی زندگی کے ہر حق سے محروم ہیں۔ دولت کا ارتکاز چند بڑے بڑے زمینداروں اور سرمایہ داروں کے پاس ہے۔ لوٹ مار' کرپشن اپنی انتہاؤں کو ہے۔ اسی بیانے نے پاکستان کو تقسیم کیا' توڑا اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ اسی بیانے کے نتیجے میں موجودہ وفاقی اکائیاں معاشی وسیاسی محرومیت کا شکار ہیں اور بعض علاقوں میں آزادی کے نعرے بلند ہورہے ہیں۔ اسی بیانے کے نتیجے میں عدلیہ سے لے کر پارلیمنٹ اور دیگر ادارے عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ مذہبی اقلیت تو عدم تحفظ کا شکار ہیں ہی مگر مسلمان آبادی کئی فرقوں میں بٹی ہے اور ہر ایک دوسرے کو مسلمان ماننے پر تیار نہیں۔ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ اس بیانیے پر جمہوریت اور جمہوری ادارے بے معنی ہوکر رہ گئے ہیں۔ پورا معاشرہ عدم برداشت' انتہاپسندی' فرقہ پرستی' تشدد اور دہشت گردی کا شکار ہے لہذا اس بیانے کو بدلے بغیر' نہ پاکستانی ریاست کا استحکام ممکن ہے نہ ہی عوام کو ان کی اچھی انسانی زندگی کا حق میسر ہوسکتا ہے اور نہ ہی جمہوری ادارے پنپ سکتے ہیں۔ یہ حکمرانوں کے لیے بھی لمحۂ فکریہ ہے اور اس ملک کی تمام جمہوری' لبرل اور ترقی پسند قوتوں کا بھی فریضہ ہے کہ اس بیانیے کو بدلنے کے لیے جدوجہد کو تیز کریں۔☆☆

20ویں صدی کے سوشلسٹ تجربات اور 21ویں صدی کے جدید تقاضے

میر حمزہ ورک

بیسویں صدی کے کامیاب اور ناکام سوشلسٹ تجربات کے تجزیہ کے لئے ضروری ہے کہ سوشلزم کے ظہور وارتقاء پر بات ہو جائے۔

طبقاتی سماج میں اونچ نیچ ،امیری غریبی کے فرق اور استحصال کے بعد مشین کی مادی طور پر آمد کے بعد سوشلزم کی بنیاد ظاہر ہوئی۔اس سلسلے میں اینگلز کے مضمون "یوٹوپیائی اور سائنسی سوشلزم" سے واضح راہنمائی ملتی ہے۔سوشلسٹ نظریہ کی فارمولیشن میں تین عوامل نے بنیادی کردار ادا کیا۔

(۱) پیرس کمیون اور انقلاب فرانس کے تجربات ۲ جرمن فلسفہ ۳ برطانوی سیاسی معیشت۔اسی تجزیہ کی روشنی میں یہ کہا گیا تھا کہ سرمایہ دار صنعتی ممالک میں سب سے پہلے انقلاب ظہور پزیر ہو سکتے ہیں۔اور ایسا جرمنی ،فرانس اور برطانیہ کی صنعتی ترقی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہا گیا تھا۔لیکن سماجی ارتقاء نے کچھ ایسی راہ اختیار کی کہ جرمنی۔فرانس اور برطانیہ کہ مقامی سرمایہ داری نے نو آبادیات پر تسلط کے بعد سامراج کا روپ دھار لیا اور ان ملکوں میں جو تضاد مزدور طبقے اور سرمایہ داری کے درمیان شدت پذیر ہونا تھا وہ بے تحاشا نو آبادیاتی لوٹ کے بعد صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملکوں میں مدھم پڑ گیا۔مارکس اور انیگلز کے دور میں زیادہ تر سرمایہ داری بھاپ کی ٹیکنالوجی کا مظہر تھی۔

بھاپ کے دور کی سرمایہ داری بجلی کے دور کی سرمایہ داری میں تبدیل ہوئی تو پیداوار میں بہت اضافہ ہوا۔اور سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان تضاد بڑھنے کی بجائے مزید نرم پڑ گیا۔

پیرس کمیون کے تجربات سے تین نتائج اخذ کئے گئے تھے۔

1. انقلاب کے وقت ریاستی ڈھانچہ کو مکمل توڑنا۔
2. زمین، بنک اور بڑی صنعت کا قومی ملکیت میں لینا۔
3. مزدر طبقے کے سب سے بڑے اتحادی کِسان کو ساتھ ملانا۔

اِس پس منظر میں پہلا سوشلسٹ انقلاب 1917ء میں روس میں وقوع پذیر ہوا۔یہ انقلاب کسی سامراج گزیدہ ملک میں برپا نہیں ہوا تھا۔بلکہ اس وقت روس خود جرمنی ،فرانس، برطانیہ وغیرہ کے بعد چھٹی سامراجی قوت تھا۔روس میں پیداواری قوتیں تو سرمایہ دارانہ تھیں لیکن اوپر ڈھانچہ Super Structure اور سیاسی نظام ذراشاہی بادشاہت تھی۔

جو بدترین قسم کی جاگیرداری پر مبنی تھا۔یہ انقلاب سوشلسٹ نہیں تھا بلکہ اکتوبر انقلاب سے 6 ماہ قبل کرنسی کی کی قیادت میں ہونے والے سرمایا درانہ جمہوری انقلاب کو ہی لینن اور اُسکی پارٹی نے آگے بڑھایا چونکہ سرمایا درانہ سیاسی قوتیں لینن اور اس کی پارٹی سے کمزور تھیں۔اس لئے کیمونسٹ اس انقلاب کو بورژ وازی سے چھین کر آگے بڑھانے میں کامیاب ہوگئے۔اس لئے اس انقلاب میں سرمایہ دارانہ نظام کی تمام آلائشیں اور خرابیاں بھی منتقل ہوئیں۔اگر اوپری ڈھانچہ یا Super Structure زارشاہی و جاگیر درانہ کی بجائے جمہوری ہوتا تو یہ خرابیاں اس انقلاب میں منتقل نہ ہوتیں۔

دوسری شکل مشرقی یورپ کے انقلابات کی ہے۔یہ انقلابات روسی فوج کے نازی ازم کو پیچھے دھکیلنے کے بعد سرخ فوج کے طفیل نمودار ہوئے۔مشرقی جرمنی، پولینڈ، چیکوسلواکیہ، یوگوسلاویہ، ھنگیری، رومانیہ، بلغاریہ وغیرہ پر روسی افواج نے وہاں پر موجود کمزور کیمونسٹ پاٹیوں کو اقتدار منتقل کر دیا۔لہذا یہ ناتواں پارٹی ڈھانچوں کے اپنے تخلیق کردہ انقلاب نہ تھے۔مشرقی یورپ کی پارٹیاں نازی ازم کے خلاف قومی آزادی کی جنگ لڑ رہی تھیں اور اس صورت میں مشرقی یورپ کے اِن انقلابات میں تخلیقی جوھر موجود نہ تھا۔۔۔۔یہی نقطہ تاریخ کی جدلیات کے خلاف ہے۔جدلیات اندرونی تضاد کو مانتی ہے۔بیرونی تضاد بعد میں اثر انداز ہوتا ہے۔

انقلاب کی تیسری شکل تیسری دنیا کے پسماندہ جاگیرداری معاشروں میں سامراج کے خلاف قومی آزادی کی جنگوں کو آگے بڑھا کر برپا کیے گئے ان میں چین، ویت نام اور کوریا سرِ فہرست ہیں۔ان انقلابی پارٹیوں پر عوام کا اعتماد تھا اور وہ بہت طاقتور بھی تھیں۔

خودکاریت اور کیمونزم کی منزل

مارکسزم کے اساتذہ نے کہا تھا کہ جس طرح سامراج سرمایہ داری کی انتہائی شکل ہے اسی طرح مادی اور فنی بنیادوں کی انتہائی ترقی اور سماجی پیداوار کی عظیم تر ترقی کے بغیر کیمونزم میں داخل نہ ہوا جا سکے گا۔ کچھ دوستوں کو خودکاریت، سوشلزم اور کیمونزم میں جو ہم آہنگی ہے وہ نظر نہیں آ رہی ہے۔ یہ تو بالکل سیدھا سا سوال ہے پیداواری عمل سے چھٹکارہ مل جائے گا لیکن اس کے ساتھ جو ابہام پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ پرولتاریہ کی "پیدائش" کی رفتار سست اور کم ہو جائے گی؟ خود کاریت کا سوال سرمایہ داری اور کیمونزم دونوں کے لیے قابل غور ہے۔ خود کاریت پیداواری قوتوں کی ترقی کہ اعلیٰ ترین شکل ہے۔ خودکاریت پر مکمل عمل کرنے سے پیداواری قوتوں اور پیداواری تعلقات میں جو شدید تضاد اور ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے وہ پیداوار کی سماجی طور پر تقسیم کے بغیر دور نہیں ہو سکتا۔ سرمایہ داری۔ منڈیوں کی توسیع، ٹیرف میں کمی اور خودکاریت کے محدود استعمال سے اس تضاد کو عارضی طور پر معاندانہ بنانے سے روکنے کی کوشش کر رہی ہے اس عہد کے وسائل پیداوار کی نجی ملکیت کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ اگر خودکاریت مکمل طور پر نافذ کر دی جائے تو انسانوں کی بڑی تعداد کام سے فارغ ہو جائے گی یعنی سرمایہ داری کے عہد میں بے روزگاری پھیل جائے گی قوت خرید ختم ہونے کے قریب چلی جائے گی۔ منڈیاں سکڑ کر رہ جائیں گی۔

جب کوئی خریدار نہیں ہوگا تو پیداوار کیسی؟ تیسری دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی سے سرمایہ داری کو البتہ کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے نتیجتاً اس تضاد کو دو ہی طریقوں سے دور کیا جا سکتا ہے

ا۔ یا تو خودکاریت کے نفاذ پر مکمل روک لگا دی جائے یا پھر وسائل پیداوار کو عوامی ملکیت میں لیکر تقسیم پیداوار کا اجتماعی نظام اپنایا جائے۔

دوسرا سوال جو کچھ کامریڈوں کے ذہن میں ہے کہ خودکاریت کے عمل سے پرولتاریہ کی افزائش سست بڑ جائے گی یا پھر اب پرولتاریہ کون ہوگا؟ کیا یہ اصول طے ہو سکتا ہے کہ کسی ملک میں کل آبادی کا اتنے فیصد پرولتاریہ ہوگا تو انقلاب ہوگا ورنہ نہیں؟ بنیادی سوال پرولتاریہ کے فلسفے کا ہے تعداد کا نہیں۔ جو ملک صنعتی طور پر پسماندہ ہوتے ہیں۔ وہاں پر مرحلہ وار انقلاب کی حکمت عملی اس لیے نہیں اپنائی جاتی کہ وہاں پر پرولتاریہ کی مطلوبہ تعداد دستیاب ہی نہیں بلکہ مرحلی واریت اس لئے اختیار کی جاتی ہے کہ پیداواری قوتیں پسماندہ ہوتی ہیں یا کم ترقی یافتہ ہوتی ہیں اور سرمایہ داری کے زیر اثر یا زیر قیادت یا زیر کنٹرول پیداواری قوتوں کی نشوونما بڑھوتری یا ترقی کی بجائے یہ سارا عمل پرولتاریہ اپنی قیادت اور حکومت میں کرتا ہے اور جب پیداواری قوتیں سوشلسٹ پیداواری تعلقات قائم کرنے کے قابل ہو جاتی ہیں تو پرولتاریہ ان تعلقات کو سوشلسٹ اصولوں پر استوار کر لیتا ہے خودکاریت کے دور میں پرلتاریہ کی شکل وصورت " کیا ہوگی؟ مدت ہوئی کارل مارکس اس کا جواب دے چکا ہے "پرولتاریہ موجودہ زمانے کا اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں کا طبقہ ہے جس کے پاس اپنا کوئی ذریعہ پیداوار نہیں ہے اور جسے زندہ رہنے کے لیے اپنی قوت محنت بیچنی پڑتی ہے۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ آج کے دور کے مطابق ہم قوت محنت بیچنے والوں کی تعریف کیا کرتے ہیں وہ تھوڑے ہوں یا زیادہ ہو جسمانی قوت بیچتے ہوں یا ذہنی_ کارل مارکس نے اپنی تمام تحریروں میں کسی جگہ لفظ سوشلزم استعمال نہیں کیا اس نے ہمیشہ کیمونزم کی بات کی البتہ کیمونزم کے کئی ایک مرحلوں کا ذکر ضرور کیا۔ یعنی کیمونزم کا ابتدائی، درمیانہ اور اعلیٰ مرحلہ۔ لینن اور دیگر مارکسی دانشوروں نے کارل مارکس کے ابتدائی، کیمونسٹ سماج کو سوشلزم کا نام دیا۔ مارکس کے پورے نظریہ ارتقاء کا آج کی سرمایہ داری پر اطلاق کرنا ہے۔ اس کی باقاعدہ مکمل سوچی سمجھی اور بھرپور شکل میں قدرتی طور پر مارکس کے سامنے اصل مسئلہ یہ تھا کہ اس نظریے کو دونوں صورتوں پر منطق کر کے دکھائیں۔

سرمایہ داری کے ہونے والے خاتمے اور آئندہ کیمونزم کی ترقی پر لینن کہتا ہے کہ "تو پھر وہ کیا مسئلہ ہے جس کی بنیاد پر آئندہ کیمونزم کی ترقی کے سوال پر بحث کی جا سکتی ہے؟ اس کی بنیاد یہ ہے کہ سرمایہ داری میں ہی اس کا ابتدائی سرچشمہ ہے وہ تاریخی اعتبار سے سرمایہ داری میں سے ہی ابھرے گا اور اس سماجی طاقت کے عمل کے بل بوتے پر ابھرے گا۔ جسے خود سرمایہ داری نے جنم دیا ہے۔" مارکس نے کیمونزم کے سوال کو ہمیشہ قدرتی سائنس دان کی طرح اٹھایا۔ جس طرح وہ کسی نئی حیاتیاتی چیز کے متعلق بحث کرتا ہو کہ اس کی ابتدا یوں تھی اور جو تبدیلیاں اس میں رونما ہوئی جا رہی ہیں ان کا رخ اس طرف ہے۔

مارکسزم کو نہ پڑھنے اور نہ سمجھنے سے ایک المیہ یہ ہوا کہ پاکستان جیسے ملکوں میں مارکسٹ تحریک اور پارٹیوں کی قیادت مارکسزم کے ان پڑھوں کے ہاتھ میں آ گئی

ہے۔ سرمایہ داری اور خود کاریت کی یلغار اور 1990ء کی پسپائی دیکھ کر مایوسی کے غلبے کے سوا ہمار

اراستہ کیا ہوسکتا تھا؟ مارکسزم کے درج ذیل نقاط ہمیشہ یاد رہنے چاہئیں۔

1- سرمایہ داری کی عمارت جاگیرداری کے کھنڈرات پر رکھی گئی ہے۔

2- سوشلزم یا کیمونزم کی عمارت سرمایہ داری کے کھنڈرات پر نہیں بلکہ اس کے اندر سے اور اس کی ترقی کی ایک خاص سطح پر استوار ہوگی۔

3- سرمایہ داری زوال پذیر ہے" کا ہمیشہ غلط مطلب سمجھا گیا۔ ہم نے اس کا مطلب یہ نکالا کہ پیداواری قوتوں میں پسماندگی کے نتیجے میں سرمایہ داری کو زوال آجائے گا حالانکہ مارکسزم کی روشنی میں اس کا مطلب یہ کہ پیداواری قوتوں کی ترقی کی وہ انتہائی سطح جہاں پر پیداواری تعلقات کی تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ بصورت دیگر ترقی کا عمل روکنا پڑتا ہے۔ یہ وہ بنیادی مقام ہے جس سے سرمایہ داری کی زوال پذیری کا مطلب لیا گیا ہے۔ کارل مارکس نے گوتھا پروگرام پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ سرمایہ دارانہ سماج اور کیمونسٹ سماج کے درمیان ایک ایسا دور پڑتا ہے جو پہلے کے دوسرے انقلاب میں انقلابی طور پر تبدیل ہوجانے کا نام ہے"۔

اس دور کے مطابق عبوری سیاسی دور بھی ہوتا ہے جس میں ریاست پرولتادیہ کی انقلابی ڈکٹیٹر شپ کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی۔ اب سوال ذرا مختلف طریقے سے پیش کیا جاتا ہے۔ "سرمایہ دارانہ سماج جو کیمونزم کی طرف بڑھتا جارہا ہے اس کا کیمونسٹ سماج میں تبدیل ہوجانا اس وقت تک ناممکن ہے جب کہ ایک سیاسی عبوری دور نہ گزارا جائے۔ اور اس دور میں ریاست کی معیشت صرف پرولتادیہ کی انقلابی ڈکٹیٹر شپ ہوگی "مارکس نے لاسال کے خیال کا رد پیش کرتے ہوئے کہا کہ "ہمیں یہاں جس چیز سے بحث ہے وہ کیمونسٹ سماج ہے۔ ایسے نہیں جیسے کہ خود اپنی بنیادوں پر کھڑا ہو کر بلکہ اس کے خلاف سرمایہ دارانہ سماج سے تازہ ابھرا ہوا اور اس طرح معاشی ہو، اخلاقی ہو یا ذہنی، ہر لحاظ سے اس پرانے سماج کا جنم داغ باقی ہوگا جس کے بطن سے وہ پیدا ہوا ہے۔"

اکیسویں صدی کے آغاز سے انسانی ترقی کی رفتار میں موجودہ رفتار سے کئی گنا اضافہ ہو جائے گا۔ ماضی میں جو ترقی صدیوں میں ہوتی وہ اب کے چند سالوں کی بات ہوگی خود کاریت کے عمل میں سرمایہ داری جتنا چاہیے گی اضافہ کرے گی۔ لیکن فنی ترقی کی یہ رفتار اگر مکمل طور پر نافذ کردی گئی تو انسان پیداواری عمل سے باہر ہو جائے گا، پیداواری قوتوں کی ترقی کی ایسی ہی سطح پر مارکس نے کیمونسٹ سماج کے اعلیٰ مرحلہ کی بات کی تھی مارکس نے کہا کہ کیمونسٹ سماج کا اعلیٰ مرحلہ یہ ہے کہ جب فرد تقسیم محنت کے غلامانہ بندھوں سے آزاد ہو چکا ہو جب محنت صرف زندگی کی بسر کرنے کا ایک ذریعہ نہیں بلکہ زندگی کا اولین تقاضا بن چکی ہو۔ جب فرد کے ہر پہلو سے ترقی یافتہ ہو جانے کے ساتھ ساتھ پیداواری قوتیں بھی بڑھ چکی ہوں اور سماجی دولت کے سارے چشمے رواں دواں ہوں اور دولت کی افراط ہو رہی ہو۔ تب جا کر بوژر واحق کی تنگ سرحدیں پوری طرح پار کی جاسکتی ہے اور سماج اس قابل ہوسکتا ہے کہ اپنے پرچم پر لکھ دے ہر ایک سے اس کی قابلیت کے مطابق اور ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق۔۔۔ مندرجہ بالا مارکس کے الفاظ میں قابل غور نقطہ یہ ہے کہ پیداواری قوتوں کی اعلیٰ درجے کی ترقی اور خود کاریت کی بدولت ذہنی اور جسمانی محنت کے درمیان تضاد کا خاتمہ ممکن ہو سکے گا مزید یہ کہ ریاست کے مکمل طور پر مٹنے یا ختم ہونے کی معاشی بنیاد کیمونزم کی ترقی کا یہی مقام ہے جب ذہنی اور جسمانی محنت کے درمیان تضاد ختم ہو جاتا ہے اور نتیجے میں موجود سماجی نابرابری کا ایک بڑا سبب دور ہو جاتا ہے اور بقول لینن ایک ایسا سبب جو ذرائع پیداوار کو پرائیویٹ ملکیت سے چھین کر سماجی بنا دینے اور سرمایہ داروں کی بے دخلی سے ہی کسی حالت میں یکدم ختم نہیں ہوسکتا ہے۔

ترقی یافتہ دنیا کے مختلف ملکوں میں پیداواری قوتوں کی ترقی کا وہ مرحلہ جو خود کاریت پر مبنی ہے آن پہنچا ہے۔ اور یہی وہ مرحلہ ہے جہاں پر کیمونزم کے نفاذ سے ہی خود کاریت کے مرحلے کو لاگو کیا جاسکتا ہے اور پیداواری قوتوں کی ترقی کا عمل مزید جاری رکھا جاسکتا ہے۔ سرمایہ داری یا ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کسی بھی صورت میں خود کاریت پر عمل درآمد نہیں ہونے دے گی نتیجتاً پیداواری قوتوں کی ترقی کا عمل ایک خاص سطح پر پہنچ کر سرمایہ داری اسے روک لگا دے گی اور لگا رہی ہے ایسی صورت میں سرمایہ داروں کی ملکیت پر سے بے دخلی خود زمانے کی ترقی کے لیے ضروری ہوگئی ہے لینن کہتا ہے کہ اس بے دخلی سے یہ امکان ضرور پیدا ہوگا کہ پیداواری قوتیں بے پناہ بڑھ جائیں اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ

سرمایہ داری کس قدر نا قابل یقین طریقے سے اس ترقی کی راہ روک رہی ہے تکنیک آج جس درجے کو پہنچ چکی ہے اس کی بدولت کتنی کچھ ترقی کی جاسکتی تھی تو ہمیں پورے اعتماد سے کہنے کا حق ہے کہ سرمایہ داروں کی بے دخلی کی وجہ سے انسانی سماج کی پیداواری قوتیں واقعی کہیں سے کہیں پہنچ جائیں گی لیکن یہ بات کہ ترقی کی یہ رفتار کتنی تیز ہوگی۔ کتنی مدت میں وہ اس منزل تک جا پہنچے گی کہ تقسیم محنت کے بندھن سے اپنا پیچھا چھڑالے۔ ذہنی اور جسمانی محنت کی مخالفانہ حیثیت دور کر دے اور محنت کرنے کو زندگی کا اولین تقاضا بنادے ابھی نہ ہم جانتے ہیں نہ جان سکتے ہیں۔

ٹیکنالوجی انقلاب کے اثرات

بھاپ اور بجلی کے بعد STR (سائنٹیفک اینڈ ٹیکنالوجی انقلاب) انقلاب نے معیشت کی کایا پلٹ کر رکھ دی ہے۔ اینگلز نے 1868 میں سرمایہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اب تک سیاسی معیشت نے ہم کو سکھایا تھا کہ محنت تمام دولت کا سرچشمہ اور تمام قوتوں کا پیمانہ ہوتی ہے اور اسی طرح ایسی دو اشیاء کی جن کی پیداوار پر ایک ہی وقت محنت صرف ہوئی ہو یکساں قدر کی حامل ہوتی ہے اور ان کا آپس میں بھی تبادلہ کیا جاسکتا ہے کیونکہ اوسط صرف برابر کی قدریں ہی ایک دوسرے سے تبادلہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ اوسط صرف برابر کی قدریں ہی ایک دوسرے سے تبادلہ کرنے کے قابل ہوتے ہیں اس کے ساتھ ہی ساتھ مگر وہ سکھاتی ہے کہ ایک طرح کی ذخیرہ کی ہوئی محنت بھی ہوتی ہے جس کو وہ سرمایہ کہتی ہے۔ اور یہ بھی کہ سرمایہ، اپنے ان امدادی وسائل کے باعث جو اس کے اندر موجود ہوتے ہیں زندہ محنت کی کارگزاری کا سینکڑوں اور ہزاروں گنا بڑھا دیتا ہے اور اس کے بدلے میں ایک معاوضہ طلب کرتا ہے جس کو اصطلاحاً نفع یا فائدہ کہتے ہیں جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ حقیقت میں یہ اس طرح رونما ہوتا ہے کہ ذخیرہ کی ہوئی مردہ محنت کے منافع روز بیروز بھاری بھرکم ہونے لگتے ہیں سرمایہ داروں کا سرمایہ دیوپیکر ہونے لگتا ہے جبکہ زندہ محنت کی اجرت متواتر گھٹتی ہے۔

اگر سرمایہ داروں کا سرمایہ 1868ء میں دیوپیکر تھا تو اب STR کے دور میں کیا ہے؟

1883 میں مارکس کی وفات ہوئی اس کے سترہ سال بعد بیسویں صدی طلوع ہوئی۔ اس کے سترہ سال بعد لینن کی پارٹی نے مارکسزم کا اطلاق پہلی بار کیا 1949ء میں چین کا عوامی جمہوری انقلاب برپا ہوا۔ یہ انقلاب مارکسزم کے عملی اطلاق کی درخشاں مثالیں ہیں۔ مارکسٹ نظریے میں مارکس اور لینن کے بعد کسی نے خاطر خواہ اضافہ نہیں کیا۔

ہم اُسی :پرانے نظریے سے STR کے دور کے کام نکالنا چاہتے ہیں اور جب کام نہیں بنتا تو ایک دوسرے پر الزام لگاتے ہیں یا اپنی ہی پُشت پر کوڑے برساتے ہیں کہ ہم محنت نہیں کرتے۔ عوام میں نہیں جاتے وغیرہ وغیرہ۔ STR کا زمانہ سوشلسٹوں کی امداد کے بغیر ہی اپنی راہیں نکال رہا ہے آج کا دور آج کی تکنیک کا طلب گار ہے اور آج کے نظریات کا متقاضی ہے۔ سوآنے والی صدی تمام سوشلسٹوں سے 21 ویں صدی کے سوشلزم کا تقاضا کرتی ہے۔ سلفا اور پنسلین، اکتوبر انقلاب اور عوامی جمہوری انقلاب اپنے دور کے معجزے تھے۔ بہت کارآمد تھے۔ انسانیت کے لئے نعمت عظیم تھے آج کے دور کے لئے آج کی نعمتیں درکار ہیں۔ ارتقاء کا سفر جاری و ساری ہے۔ پرانی ادویات کی جگہ نئی ادویات، پرانی تھیوری کی جگہ نئی تھیوری، اور بالآخر نئے نظریات----- یہی کام معاشرے کی سائنس سوشلزم میں کیوں نہیں؟ غلطیوں کے ادراک اور اصلاح سے سائنس آگے بڑھتی ہے۔ مرتی نہیں۔ یہ خوف مذاہب کو مبارک ہو۔ ڈاکٹر لوگ دوائی کے (Side Effects) اور خرابیوں کا ذکر کرنے سے نہیں کتراتے۔ انھیں دوائی کی ناراضگی کا ڈر نہیں---- تو سوشلسٹ کیوں سوشلزم کی خرابیوں کے ذکر سے شرماتے ہیں؟ یا پھر سوشلزم سے ہماری صرف جذباتی وابستگی ہے۔ اگر آج تمام ڈاکٹر وفات پا جائیں پھر بھی سائنسی علم کی جگہ اسلامی طب نہیں لے سکتا۔ نظریہ صرف بہتر اور برتر ہوگا تو بات بنے گی۔

پاکستان جدید سے جدید تر ہو رہا ہے۔ کثیر منزلہ عمارتیں، جدید ٹرانسپورٹ۔ جدید آرمی۔ پانی، بجلی، گیس کا نظام۔ جدید زراعت۔ آبادی کا شہروں میں ارتکاز۔ پاکستان میں پرولتاریہ کتنا ہے؟ شہروں کی آبادی کروڑوں میں ہے۔ آج پرولتاریہ کا قیادتی کردار کیسا ہوگا؟ اور کتنا ہوگا؟ سماجی پیداوار اور سماجی نظام کی ضرورت بڑھتی جا رہی ہے.....اس لئے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ بڑے شہروں میں غیر شعوری طور پر اجتماعیت میں ڈھلے لوگ جدید سوشلسٹ نظریہ کو اپنا سکتے ہیں اور اُسے آگے بڑھا سکتے ہیں۔

☆.....☆

فرسودہ عالمی تجارتی نظام معاشی مسائل کا حل نہیں

نجم الحسن عطا

آج سائنسی ایجادات ہی اقوام کی تہذیب' ثقافت اور مقدر کا تعین کرتی ہیں یعنی سائنسی علت ومعلول سے عاری اقوام کے (جو تخلیقی یا غیر روایتی سوچ نہیں رکھتیں) خیالات و افکار خواہشات اور تواہم پرستی پر مبنی ہوتے ہیں ایسی اقوام دنیا میں رونما ہونے والے حالات وواقعات پر اثر انداز ہوسکتی ہیں اور نہ ہی ان میں معیاری اور دیر پا تبدیلی آ سکتی ہے پاکستان کی موجودہ معاشی صورت حال کسی المیے سے کم نہیں اور اس حقیقت سے صرف بدعنوان طبقہ ہی انکار کرسکتا ہے یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ عالمی تجارت میں پاکستان کا حصہ فقط 0,01 فیصد سالانہ ہے اور اس کی برآمدات کا حجم صرف 22 ارب ڈالر ہے جبکہ 2016 میں محض 40 لاکھ آبادی کے حامل ملک سنگاپور کی برآمدات کا حجم 516 ارب ڈالر تھا اس سے ہمارے حکمرانوں کی معاشی کارکردگی عیاں ہوتی ہے ستم ظریفی دیکھیے کہ ایک زمانے میں بنگالیوں کا مذاق اڑایا جاتا تھا لیکن آج ان کی برآمدات کا حجم 38 ارب ڈالرز ہے پھر اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ آج پاکستان کی پانچ فیصد آبادی کے پاس بے تحاشا دولت ہے یہ طبقہ اشرافیہ ٹیکس چوری کرتا ہے اور اس کا سارا بوجھ بالواسطہ ٹیکسیز کی صورت میں غریب ومفلس عوام پر پڑتا ہے جسے تعلیم یافتہ بنایا گیا نہ ہی ہنرمند۔ ملک میں تعلیمی سہولتوں کی صورتحال یہ ہے کہ آج بھی 2.5 کروڑ بچے اسکولوں سے باہر ہیں اور جو تعلیم حاصل کررہے ہیں ان کے والدین کی چادر بھاری فیسیں ادا کرتے کرتے رومال بن گئی ہے جہالت کے سبب ہی آج کرپٹ سیاستدانوں اور حکمرانوں کے بارے میں عوام میں یہ سوچ پائی جاتی ہے کہ لیڈر اگر کھاتا پیتا ہے تو کچھ لگاتا بھی ہے'' اسی تناظر میں امریکی شاعر ایمرسن کے خیالات نقل کیے جارہے ہیں کہ ''ہمیں گھڑے گھڑائے مصنوعی افراد کی ضرورت نہیں جو کسی پیشہ ورانہ کام کے لائق ہوں بلکہ کچھ ایسے افراد کی ضرورت ہے جو اپنی قوتِ ارادی کے بل پر کسی بھی کام میں ہاتھ ڈال سکتے ہوں۔ دنیا میں جتنے بھی بہترین کارنامے وقوع پذیر ہوئے ہیں یعنی طبّاع افراد کے کارنامے ان پر کوئی لاگت نہیں آئی نہ ہی ان کی کوئی قیمت ادا کی گئی اور نہ ان کے لیے کوئی مشقت اٹھائی گئی بلکہ یہ تو فکر کے بے ساختہ دھارے ہیں۔ شکسپیر نے ہیملٹ اتنی آسانی سے لکھ ڈالا تھا کہ جتنی آسانی سے کوئی پرندہ اپنا گھونسلہ بناتا ہے۔ بڑی بڑی نظمیں بغیر کسی توجہ کے سوتے جاگتے لکھی گئیں عظیم مصوروں نے حصول مسرت کے لیے تصویریں بنائیں اور انہیں یہ خبر تک نہ ہوئی کہ ان کی شخصیت نے خیر کو جنم دیا۔''

ایمرسن فن کے پس منظر میں اپنا موقف بیان کررہے تھے لیکن اگر اسے سائنس پر لاگو کیا جائے تو بجلی ایجاد کرنے والے نے بھی اس کی قیمت طلب نہیں کی لیکن نہ جانے پاکستان میں ایسے افراد کیوں ناپید ہوگئے ہیں عصر حاضر میں پاکستان جس موڑ پر آ کھڑا ہوا ہے اور وہ معاشی بربادی اور لوٹ مار کا دور ہے اور معیشت کی بحالی کے لیے وفاقی وزیر خزانہ اسد عمر نے فنانس بل میں ترامیم کرکے آئی ایم ایف کا نسخہ قرض لینے سے پہلے ہی پیش کردیا ہے درحقیقت چاہے شوکت عزیز یا اسحاق ڈار یا موجودہ معاشی ٹاسک فورس کوئی بھی روایت سے ہٹ کر سوچنے پر آمادہ نہیں کیونکہ کہ ان سب نے سرمایہ دارانہ نظام کو چلانے کے لیے تحریر کی گئی معاشیات کی کتابیں ہی پڑھ رکھی ہیں سو ان کے پاس فکر کے بے ساختہ دھارے موجود نہیں پھر تبدیلی کی علم بردار حکومت ابھی نوآموز ہے جس کی نظر یے تک رسائی ہے اور نہ ہی یہ دانا ہے۔ یہ قطرے میں دجلہ نہیں دیکھ سکتے کہ یہ گھڑے گھڑائے لوگ ہیں یہ وہی کچھ کرسکتے ہیں کہ جو انہوں نے آئی ایم ایف کے نصاب میں پڑھا ہے اور نہ ہی یہ قرضوں میں ڈوبے پاکستان کے کرپٹ معاشرے کے مسائل حل کرنے کے قابل ہیں البتہ اگر ہم ملائشیا کو ترقی یافتہ ملک بنانے والے مہاتیر محمد کے ماڈل کو دیکھیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر سرمایہ دارانہ نظام میں بے ایمانی' ایمانداری سے کی جائے تو ترقی کی گنجائش نکل سکتی ہے لیکن کرپشن سرے سے ختم نہیں ہوسکتی کیونکہ اگر کرپشن ختم ہوگئی تو سرمایہ دارانہ نظام زمیں بوس ہوجائے گا۔

پاکستان میں فی الوقت پائیدار تبدیلی ممکن نہیں اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ ستر برس میں ہم نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی جانب توجہ ہی نہیں دی ہم نے صرف قرضوں پر اکتفا کیا جو آج 95 ارب ڈالرز تک پہنچ چکے ہیں اور ان کا سود ادا کرنے کے لیے مزید قرضے لینا پڑتے ہیں ہمارے حکمرانوں نے پاکستان کے قدرتی وسائل اور انسانی سرمائے کو کبھی استعمال کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اگر عوام کو ہنرمند بنایا جاتا تو آج ہمیں سی پیک سے چین کے برابر ہی فائدہ ہوتا۔ جس ملک میں ادائیگیوں کے توازن میں خسارہ 35 ارب ڈالرز سے زائد ہو تو

وہاں اسد عمر بھی مائنس پلس کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وفاقی وزیر خزانہ نے منی بجٹ پیش کیا اپنی بجٹ تقریر میں انہوں نے حقائق بیان کیے اور مسائل کا وہی حل بتایا جو آئی ایم ایف کا نصاب پڑھنے والا ایک معیشت داں بتا سکتا ہے سابق وفاقی وزیر مفتاح اسماعیل نے گزشتہ حکومت کے آخری بجٹ میں دانستہ طور پر آمدنی کے ذرائع کو کم کر کے اخراجات بڑھا دیے لہذا اسد عمر کا یہ کہنا درست ہے کہ مالی سال 19-2018 کے بجٹ میں مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے اخراجات میں 350 ارب روپے کا اضافہ کیا گیا ہر چند کہ سابق وزیر خزانہ کو اس بات کا علم تھا کہ صوبوں کا پچھلے مالی سال کا بجٹ 18 ارب روپے خسارے میں تھا لیکن اس کے باوجود دانستہ طور پر سرپلس کا ہدف 266 ارب روپے مقرر کیا گیا خیال رہے کہ اعداد و شمار کے ایسے ہی گورکھ دھندوں کی بنا پر آئی ایم ایف نے سابق وزیر خزانہ شوکت عزیز پر جرمانہ بھی عائد کیا تھا لیکن پاکستان کا ہر میزانیہ ہی اعداد و شمار کا گورکھ دھندا ہوتا ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں معیشت کا انحصار ٹیکسیز پر ہوتا ہے اور ٹیکس چوری کرنے والے مجرموں ہی نے پاکستان کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے تاہم اس کے باوجود بھی موجودہ وفاقی وزیر خزانہ نے براہ راست ٹیکسوں میں اضافہ کیا اور نہ ہی معیشت کو دستاویزی شکل دینے کا فیصلہ کیا کیونکہ اگر وہ ایسا کرتے تو ان کی اپنی حکومت ختم ہو جاتی سو اس ملک میں ٹیکس چوری کا خاتمہ ممکن نہیں اور ریونیو بڑھانے کے لیے عام آدمی پر ہی بالواسطہ ٹیکسیز لگائے جاتے رہیں گے۔

موجودہ حکومت کو اس وقت زرمبادلہ کے ذخائر میں اضافے کی اشد ضرورت ہے اور اگلے دو برس میں اس نے 25 ارب ڈالرز کے قرضوں کی ادائیگی بھی کرنی ہے سو اس نے 183 ارب روپے ریونیو اکٹھا کرنے کے لیے ٹیکسیز اور کسٹم ڈیوٹیز میں اضافہ کیا ہے اگرچہ صرف آگ تاپ لینے سے ملیریا کی سردی دور نہیں ہوتی لیکن آئی ایم ایف کے نسخے پر عمل کرنے کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے منی بجٹ میں ترقیاتی بجٹ کا ہدف 725 ارب روپے مقرر کیا گیا ہے حالانکہ بجٹ خسارہ 2.200 ارب روپے ہے اور گردشی قرضے 200 ارب روپے تک پہنچ چکے ہیں یاد رہے کہ گزشتہ دو دہائیوں کے دوران ملک کو جس بیدردی سے قرضوں کے سہارے چلایا گیا اور لوٹ مار کی گئی اس کی مثال دنیا میں شاید ہی کہیں اور ملے حکمرانوں کی عاقبت نااندیشی کے سبب غربت اس قدر بڑھ چکی ہے کہ عوام تیزی سے جرائم کی طرف مائل ہو رہے ہیں ملک میں روزگار کی صورتحال یہ ہے کہ 61 فیصد نوجوان بیروزگار ہیں لیکن دوسری جانب بعض افراد کے پاس دولت کی فروانی ہے جو گرے یا بلیک اکانومی کا نتیجہ ہے موجودہ حکومت اگر اس معیشت میں تیس فیصد بھی کمی لاتی ہے تو یہ اس کا ایک کارنامہ ہوگا ملک کا تنخواہ دار طبقہ مجبوراً ٹیکس ادا کرتا ہے کہ یہ اس کی تنخواہوں سے کاٹ لیا جاتا ہے جبکہ زرعی شعبے سے جس کا جی ڈی پی میں 22 فیصد حصہ ہے صرف چند کروڑ روپے ہی ٹیکس حاصل ہوتا ہے کہ زیادہ تر بڑے زمیندار پارلیمنٹ میں بیٹھے ہیں اور 93 فیصد چھوٹے کاشت کاروں کی حالت زار ناگفتہ بہہ ہے گزشتہ حکومت میں ملک میں تیار ہونے والی سستی کھاد کو برآمد کیا جاتا تا کہ صنعت کاروں کو زرمبادلہ کمانے کا موقع ملے اسی طرح فاضل چینی حاصل کر کے اسے بھی زرمبادلہ حاصل کرنے کے لیے برآمد کیا جاتا اور اس کا بڑا حصہ بیرون ملک رکھا جاتا جو منی لانڈرنگ کے علاوہ ہوتا تھا موجودہ حکومت چاہتے ہوئے بھی اس قسم کی کرپشن نہیں کر سکتی کیونکہ یہ ایک جانب نازک صورت حال سے دوچار ہے اور دوسری طرف بڑے زمیندار حکمران جماعت میں شمولیت اختیار کر چکے ہیں۔

منی بجٹ میں انکم ٹیکس کی مد میں چار لاکھ سے کم سالانہ آمدنی والے افراد ہی کو استثنا دیا گیا ہے جو سابق وفاقی وزیر مفتاح اسماعیل نے دیا تھا جبکہ جن ٹیکسیز میں اضافہ کیا گیا' انفرادی سطح پر ان گروپس کی تعداد 70 ہزار ہے حیرت کی بات ہے کہ کراچی میں بعض چاٹ فروش اور پان بیچنے والے لاکھوں روپے منافع کماتے ہیں لیکن ٹیکس ادا نہیں کرتے اور چند دولت مند افراد جو سالانہ 35 فیصد انکم ٹیکس ادا کر رہے تھے اسد عمر نے اسے کم کر کے 29 فیصد کر دیا ہے جبکہ مفتاح اسماعیل نے اسے تیس فیصد کر دیا تھا اسے کوئی کھیلتو کہا جا سکتا ہے بجٹ بنانے کا طریقہ نہیں اور کوئی بھی معیشت داں یہ سب کر سکتا ہے کہا جا رہا ہے کہ 183 ارب روپے کے ریونیو میں سے 92 ارب روپے ایف بی آر وصول کرے گا یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 35 لاکھ مالدار ٹیکس دہندگان سے ٹیکس وصول کیوں نہیں کیا جاتا اور کب تک پیٹرول' بجلی اور گیس کے نرخ بڑھا کر غریب عوام کا کچومر نکالا جاتا رہے گا۔ واضح رہے کہ ایک اندازے کے مطابق گزشتہ پندرہ برس کے دوران بجلی کے نرخوں میں 350 فیصد اضافہ ہوا ہے اس ملک کی سیاہ بختی ہے کہ یہاں ٹیکس چور منی لانڈرنگ کرنے والے اور پی آئی اے اور اسٹیل ملز اور پاکستان ریلویز سمیت دیگر سرکاری ادارے تباہ کرنے والے تو عیش کر رہے ہیں جبکہ عام آدمی کا استحصال جاری ہے۔

اسی طرح ملک میں فائلر اور نان فائلر کا کھیل بھی کھیلا جا رہا ہے۔ یہاں سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا زرعی ایمرجنسی لگا کر ریونیو حاصل نہیں کیا جا سکتا؟ کیا

فوڈ انڈسٹری کو فروغ نہیں دیا جاسکتا؟ یہ ملک معدنیات سے مالا مال ہے لیکن اس جانب کسی حکومت نے توجہ نہیں دی آج پانی زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا ہے دنیا بھر میں منرل واٹر ایک فراڈ ہے جبکہ پاکستان میں منزل واٹر تیار کرنے والی کمپنیوں کو کھلی چھوٹ دے دی گئی ہے ہم ایک کاغذ کے ٹکڑے (ڈالر) کے عوض اپنے اثاثے فروخت کرنے پر مجبور ہیں اس سے اندازہ لگائیں کہ یہ سودی نظام کتنا بھیانک ہے پھر ۷۰ برس بعد بھی ہم مصنوعات سازی کے قابل نہیں ہوئے اور صرف اسمبلنگ ہی کررہے ہیں ایک ایسے ملک کو روایتی طریقوں سے چلانا نہایت مشکل ہے جس کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہو جہاں زراعت کا انحصار موسمی بارشوں پر ہو اور بجلی پیدا کرنے کے لیے فرنس آئل جیسا مہنگا ترین ذریعہ استعمال کیا جاتا ہو اور سامراج کی خوشنودی کے لیے ہائیڈرل پاور جیسے سستے ترین ذریعہ پر توجہ نہ دی گئی ہو مختصراً یہ کہ گزشتہ ستر برس کے دوران اس ملک کے حکمرانوں نے ہر وہ کام کیا جس سے صرف انہیں فائدہ ہو۔

موجودہ عالمی تجارتی نظام چلانے والی عالمی تجارتی تنظیم کے خلاف امریکی صدر ٹرمپ اب بات کررہے ہیں جبکہ آج سے دوسو برس قبل کارل مارکس نے آزاد تجارت کے بارے میں یہ تاریخ ساز جملے کہے تھے کہ اگر آزاد تجارت کے حامی یہ نہیں سمجھ سکتے کہ کس طرح ایک قوم کی قیمت پر دوسری قوم امیر ہوسکتی ہے تو ہمیں حیران ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ لوگ یہ سمجھنے سے بھی انکار کرتے ہیں کہ ایک ہی ملک میں ایک طبقہ دوسرے طبقہ کی قیمت پر کس طرح امیر ہوجاتا ہے'' وفاقی وزیر خزانہ اسد عمر اور وزیراعظم عمران خان اسی نظام کو جاری رکھنا چاہتے ہیں کہ جو زنگ آلود ہوچکا ہے اور اسے زندگی بخشنے والے عیش کی زندگی گزار رہے ہیں اور پارلیمان میں بھی نشست فرما ہیں جن کے بچے بیرون ملک پڑھتے ہیں اور جن کے اثاثے بھی ملک سے باہر ہیں اعداد وشمار کے مطابق پاکستانی شہریوں کے دوسو ارب ڈالرز غیر ملکی بینکوں میں موجود ہیں جبکہ عالمی بینک کا کہنا ہے کہ ہر سال دس ارب ڈالرز پاکستان سے بیرون ملک منتقل ہورہے ہیں تو ایسے حالات میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان کو میگا پروجیکٹس سے زیادہ میگا وژن کی ضرورت ہے آج بیرون ملک موجود سیکڑوں اربوں ڈالرز کے اثاثے ملک واپس لانے کی اشد ضرورت ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارا احتساب کا نظام اور اس سے جڑے ادارے نہایت کمزور اور طاقتوروں کے غلام ہیں یاد رہے کہ اگر فوج اور عدلیہ نے اس جانب سنجیدگی سے توجہ نہ دی تو غریبوں کے مسائل کبھی حل نہیں ہوں گے۔

☆☆☆

کامریڈ حسن ناصر کی برسی پر ایک پنجابی نظم

عبدالستار خاور (کبیر والا)

اوس شہید نوں سرخ سلام — جو اج وی جیوے وچ عوام
سید علمبردار حسین — نواب گھرانہ سارے کہین
سی وچ بنجار ھلز رہائش — حسن ناصر دی ہوئی پیدائش
بھانویں نازاں نال سی پلے — جیندے رھے مزدوراں رلے
تقسیم توں پہلاں انڈیا اندر — سی پی انڈیا دے سی ممبر
حیدر آباد، دکن ، تلانگانہ — بغاوت کیتی جدھوں کساناں
یک جہتی نال کساناں کیتی — جدوجہد یگانہ کیتی
ونڈ ہوئی تاں آئے کراچی — منزل لبھدے رھے گواچی
سی پی پاکستان اچ رلے — مزدور کدھی نہ چھڈے کلے
جدجہد دا ویکھ حوالہ — حکومت دتا دیس نکالا
مزدور ورھیاں پچھوں آئے — آمر دے نال آ ٹکرائے
حکومت نے اغوا کر واکے — لہور قلعے دے وچ پہنچا کے
جد چلائی ظلم دی لٹھ — تیرہ نومبر سی سن سٹھ
میجر اسحاق محمد لیتی — رج پیروی کیس دی کیتی
پتر نوں ماں ملدی کاش — پر انہاں اور وکھائی لاش
اے نہیں میرے دل داچین — کہے زہرا علمبردار حسین
آپہ مینوں لاش وکھائی جعلی — کہہ کے ٹر گئی ہتھوں خالی
اس دیاں سی طبقاتی راہواں — کیہنج میں اوھدا درد ونڈاواں
لکھ منایئے اوھدی برسی — اوھدا کدی نہ سینہ تھرسی
چھڈ گئے نیں جو کار ادھوری — جد تائیں کریئے نہ او پوری
اینج نا کارنوں تھتھا کر یئے — آ ہن لیفٹ اکٹھا کریئے
حسن ناصر دا جیہڑا رستہ — اوسے رستے ساڈا دستہ
طبقاتی جدوجہد اپنایئے — خاور برسی اینج منایئے

☆☆☆

پاکستانی سماج کی طبقاتی ساخت اور بنیادی تضادات

اثر امام

زیرِنظر تحریر مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات ڈھونڈنے کی سعی ہے

طبقات کیا ہیں؟

پاکستان میں طبقات کی حالت کیا ہے؟

بنیادی اور ثانوی تضادات کیا ہوتے ہیں نیز پاکستان میں ان کی نوعیت کیا ہے؟ صنفی اور دیگر سماجی تضادات کے بارے میں سماجی رشتے کیا ہوتے ہیں؟ اور پاکستان میں لوگوں کے سماجی رشتوں میں کیا کیا تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں؟

آیئے سب سے پہلے اس سوال کے جواب پر بات کریں کہ مارکسی تعلیمات کی رو سے طبقہ یا طبقات کیا ہیں؟

انسانوں کا ایک سماجی گروہ جس کے معاشی مفادات ایک جیسے ہوں سارے گروہ کو ان مفادات کا مجموعی طور پر ادراک ہو اور ان کی اجتماعی کارگزاری کے نتیجے میں ان مفادات میں اضافہ ہو رہا ہوتا ہو' طبقہ کہلاتا ہے پورے گروہ کے معاشی مفادات کے یکساں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انفرادی طور پر ہوسکتا ہے کہ ایک ہی طبقے کے لوگوں کے مفادات آپس میں ٹکراتے بھی ہوں جس طرح کبھی کبھی ہمارا تجربہ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ دو بھائیوں کی بھی نہیں بنتی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں لیا جائے گا کہ وہ دونوں افراد ایک طبقے سے تعلق نہیں رکھتے اس کو مزید واضح کرنے کے لیے ہم کہیں گے کہ مارکسی تعلیمات کے مطابق طبقہ انسانوں کا ایک ایسا گروہ ہوتا ہے جس کے معاشی' سیاسی' سماجی اور دیگر مفادات و رجحانات ایک ہی طرح کے ہوں اور دوسرے طبقات سے مختلف ہوں اور انسانی معاشرے میں بنیادی تضادات کو جنم دینے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہوں اس کی مثال یوں ہے کہ ایک محنت کش کا سب سے زیادہ مفاد اس بات میں پنہاں ہوتا ہے کہ اس کی دیہاڑی بڑھائی جائے جبکہ سرمایہ دار کا سب سے بنیادی مفاد منافع کی شرح میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہوتا ہے یوں محنت کش ایک طبقہ ہوئے اور اسی طرح سرمایہ دار بھی ایک طبقہ۔ ان دونوں طبقات کے انفرادی طور پر مشترکہ مفادات بھی ہوسکتے ہیں لیکن طبقاتی طور پر ان کے مفادات ایک دوسرے سے مختلف و متضاد ہیں مارکس کے بقول طبقات اور طبقاتی مفادات اور تضادات اس وقت ایک سچائی ہوتے ہیں جب ایک سرمایہ دار محنت کش کو اس بات کا ادراک تک نہیں ہوتا مارکسی تعلیمات کے مطابق ایک طبقے کو دوسرے طبقے سے ممیّز کرنے کے لیے بنیادی طور پر دو چیزوں کو زیرِغور لایا جاسکتا ہے پہلی یہ کہ سماج کے ذرائع پیداوار کس کی ملکیت ہیں؟ دوسری یہ کہ محنت کش لوگوں کی قوتِ محنت کا کون مالک ہے؟ مارکسی تعلیمات کے مطابق پیداواری عمل کی ساخت اور اظہار ہی طبقاتی شکل پذیر کے عمل کا تعین کرتی ہے چنانچہ یہیں سے مارکس اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ معاشرے میں بنیادی طور پر دو چیزوں کو زیرِغور لایا جاتا ہے۔ پہلی یہ کہ سماج کے ذرائع پیداوار کس کی ملکیت ہیں؟ دوسری یہ کہ محنت کشوں کی قوت محنت کا مالک کون ہے۔ مارکسی تعلیمات کی روشنی میں پیداواری عمل کی ساخت اور اظہار ہی طبقاتی شکل پذیری کے عمل کا تعین کرتی ہے چنانچہ یہیں سے مارکس اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ معاشرہ بنیادی طور پر دو متحاب طبقات میں تقسیم ہوتا ہے ایک سرمایہ داروں کا طبقہ یا جنہیں بورزواژی بھی کہا جاتا ہے جو سارے پیداری ذرائع کے مالک ہوتے ہیں اور محنت کشوں کو اجرت دے کر ان کی قوت محنت بھی خرید لیتے ہیں جبکہ دوسرا طبقہ ان محنت کشوں پر مشتمل ہوتا ہے جو نہ تو ذرائع پیداوار پر مالکانہ حقوق رکھتے ہیں اور نہ کسی کی قوت محنت خرید سکتے ہیں نہ ایسا کر سکنے کی قابلیت و اہلیت کے مالک ہوتے ہیں۔ ان دو بنیادی متحارب طبقات کو اگر سرمایہ داری کے عہد سے پہلے کے طبقاتی معاشروں میں تلاش کرنا ہے تو یہ جاگیر دارانہ معاشروں میں جاگیر دار اور کسان' غلام دارانہ معاشروں میں آقا اور غلام کی صورت میں شناخت کیے جاسکتے ہیں اسی طرح پھر متعدد طبقات کا ذکر بھی کیا گیا ہے جن میں درمیانہ طبقہ اور لمپین پرولتاریہ طبقے کا ذکر بھی آتا ہے۔ بہرحال طبقات کی جتنی بھی اقسام ہیں ان میں سے ہمارے ملک پاکستان میں کتنی اقسام پائی جاتی ہیں اور وہ کون کون سی ہیں؟ آیئے اس پر غور کریں۔

سرمایہ دار/ دیسی یا قومی سرمایہ دار طبقہ جس میں مسلح افواج کے اعلیٰ افسران بھی شامل ہیں۔

صنعتی مزدور

جاگیردار/ زمیندار
کسان/کھیت مزدور
درمیانہ طبقہ اوراس کی مختلف پرتیں
لمپین پرولتاریہ

برصغیر کی تقسیم کے وقت موجودہ پاکستان میں شامل علاقوں میں صنعتی ترقی برائے نام ہی تھی کراچی کی ڈالمیا سیمنٹ فیکٹری لائل پور (فیصل آباد) کی سرشری رام کاٹن ملز اور مردان کی پریمیر شوگر ملز کے علاوہ یہاں کوئی قابل ذکر صنعتیں موجود نہیں تھیں صنعت کے حوالے سے اس وقت کا سب سے بڑا ادارہ مغل پوری ریلوے ورکشاپ تھا جو سرکاری شعبے میں تھا مذکورہ بالا صنعتیں ہندو سرمایہ داروں کی ملکیت تھیں جنہیں آزادی کے بعد یہاں سے جبری بیدخل کیا گیا تھا اس زمانے میں غیر ملکی سرمایہ بھی زیادہ تر تجارت جہاز رانی مالیات اور تھوڑا بہت کان کنی کے شعبے میں لگایا جاتا تھا تقسیم ہند کے وقت سے ہی موجودہ پاکستان کی معیشت کے بڑے حصے پر زمینداروں کی گرفت تھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ صنعت وتجارت پر ان کا غلبہ ہندو تاجروں اور ساہوکاروں کی بیدخلی اور ان کی چھوڑی ہوئی املاک پر قبضے کی وجہ سے ہی ممکن ہو پایا تھا بعد ازاں انہوں نے زراعتی بنیاد رکھنے والی صنعتوں مثلاً سوت کاتنے' آٹا پیسنے' چاول صاف کرنے کی ملوں اور ٹرانسپورٹ تک اپنے مفادات کو پھیلا دیا۔ دیہی معیشت تو ان کے غلبے میں تھی ہی اب ان میں سے کچھ بڑے زمینداروں نے بڑی صنعتوں میں بھی پیسہ لگایا اس نوزائیدہ سرمایہ دار طبقے نے حکومت کی زبردست مدد کے بل پر ۵۰ء کے عشرے کی درمیانی مدت میں اپنا سفر شروع کیا تھا جو ۶۰ء تک عروج کو پہنچ چکا تھا ہندوستان کے مقابلے میں پاکستانی بورژوازی نسبتاً ناتجربہ کار اور سیاسی واقتصادی لحاظ سے کمزور تھی چنانچہ قدرتی طور پر سامراجی سرمائے کے خلاف اس کی مزاحمت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی ہندوستان کے سرمایہ داروں کے برعکس جو حکمران کانگریس پارٹی میں اچھی طرح پھیلے ہوئے تھے پاکستان میں دیسی سرمایہ دار طبقہ سیاسی جماعت کے ذریعہ اپنی طبقاتی نمائندگی کو قائم کرنے میں کامیاب نہیں رہا پاکستان کی سیاسی جماعتوں پر جاگیرداروں/ زمینداروں کا غلبہ تھا سرمایہ داروں کے طبقاتی مفادات کے تحفظ کا دارومدار بنیادی طور پر نوکر شاہی کے ساتھ اور ان کے معاملات اور روابط پر تھا۔ یہ ایک ناقابل بھروسہ اور نازک رابطہ تھا ۵۰ اور ۶۰ء کی دہائیوں کے مقابلے میں ۷۰ کے عشرے میں پاکستان کے نوزائیدہ سرمایہ دار طبقے کو بہت نقصان اٹھانا پڑا بھٹو حکومت کی قومیائے جانے کی پالیسی اور دیگر اقدامات کی وجہ سے نجی سرمایہ کاری اپنی نچلی ترین سطح تک جا پہنچی بھٹو حکومت کی پالیسیوں کے علاوہ خود بھٹو کی ناقابل قیاس شخصیت اور عالمی اقتصادی بحران بھی اس کا ذمہ دار تھا۔ مختصراً یہ کہ پاکستان میں دو بالادست طبقات ہیں ایک دیسی سرمایہ دار طبقہ جو سامراجی کٹھ پتلی بنا ہوا ہے اس میں سول اور فوجی سرمایہ کار شامل ہیں دوسرا جاگیردار یا بڑا زمیندار طبقہ اور فوجی افسر شاہی اور غیر حاضر زمیندار اور زمینداری کو تحفظ جس کی وجہ سے معاشی وسیاسی قوت رفتہ رفتہ کم ہو رہی ہے۔

معاشی طور پر طاقت ور ان طبقات کے مقابلے میں ماتحت طبقات بہت زیادہ کمزور ہیں۔ دیہات میں کسان اور کھیت مزدور ناگفتہ بہ حالات میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ طبقاتی شعور کی کمی کی وجہ سے کسان اور کھیت مزدور سیاسی طور پر جاگیرداروں اور بڑی زمینداریوں کے مالکان کی پارٹیوں کے ووٹر اور سپورٹر ہوتے ہیں تنظیم کاری' سیاسی وطبقاتی شعور خواہ عملی طور پر اپنے آپ کا اظہار کرنے کے معاملے میں کسانوں اور کھیت مزدوروں کے مقابلے میں صنعتی محنت کش طبقہ یا پرولتاریہ کچھ بہتر حالت میں ہے۔

پاکستان میں زرعی زمینوں کی حد ملکیت اس طرح ہے 83 لاکھ 55 ہزار 2 7 7 مالکان کے پاس زرعی زمین کی نجی ملکیت 5 کروڑ 5 5 لاکھ 98 ہزار 276 ایکڑ تک ہے اگر تفصیلات میں جایا جائے تو 5 ایکڑ یا اس سے کم اراضی کے مالکان خود تو 67 فیصد ہیں لیکن ان کے پاس کل رقبہ 28 فیصد ہے 5 سے 25 ایکڑ تک کے مالکان خود 29 فیصد ہیں لیکن ان کے پاس چالیس فیصد رقبہ ہے 25 ایکڑ سے 150 ایکڑ یا اس سے بھی زیادہ کے مالکان خود محض 4 فیصد ہیں لیکن ان کے پاس 41 فیصد رقبہ ہے اب اگر صوبائی طور پر دیکھا جائے تو خیبر پختونخوا میں ایک فیصد مالکان کے پاس زرعی زمین کا 28 فیصد رقبہ ہے۔ پنجاب میں 2 فیصد مالکان کے پاس زرعی زمین کا 25 فیصد رقبہ ہے۔ سندھ میں 12 فیصد مالکان کے پاس 54 فیصد زرعی زمین ہے بلوچستان میں 14 فیصد مالکان کے پاس 81 فیصد رقبہ ہے۔ زرعی زمین کی حد ملکیت اور پیداواری حصہ داری کے اصول پر کاشتکاری وہ بنیادیں ہیں جس بنا پر ہم کہتے ہیں کہ ملک میں اب بھی جاگیری باقیات موجود ہیں ان معاشی بنیادوں کے علاوہ بڑے زمینداروں کی سیاسی وسماجی قوت۔ رعب تاب نیز فرسودہ رسوم ورواج کی موجودگی بھی اس بات

کی دلیل ہے کہ پاکستان میں اب بھی جاگیری باقیات موجود ہیں چنانچہ جنوبی پنجاب تقریباً پورے سندھ اور خیبر پختونخوا کے بیشتر حصوں میں اب بھی بٹائی پر کاشت کاری کا چلن قائم ہے جبکہ بلوچستان تو ابھی تک زیادہ تر قبائلیت کے عہد سے چھٹکارا نہیں پاسکا اور جہاں قبائلی سردار اپنے علاقے کے کاشت کاروں سے پیداوار کا چھٹا حصہ (شیشک) وصول کرتے ہیں زرعی شعبے میں آلات پیداوار کی تبدیلی اور پیداواری رشتوں اور سرمایہ کاری کا ذکر نہیں۔

پاکستان کی بڑی بورژوازی نے خاص طور پر چھٹی دہائی کے آغاز میں تیزی سے ترقی کی اسی زمانے میں ملک کی تجارتی بورژوازی تجارتی و صنعتی اور صنعتی و مالیاتی بورژوازی میں تیزی سے تبدیلی ہوئی۔ پاکستان میں بنیادی حکمران طبقہ سرمایہ دار ہی ہے جو اندرونی طور پر بڑی، درمیانی اور نچلی بورژوازی پر مشتمل ہے کسی بھی سرمایہ دارانہ سماج کے بنیادی طبقات بورژوازی اور پرولتاریہ ہوتے ہیں یہی بات پاکستانی سماج پر بھی صادق آتی ہے اب یہ الگ بات ہے کہ کسی ٹھوس معاشرے اور سماجی نظام کے حالات میں یہ دونوں طبقات، بحیثیت بنیادی طبقات، عددی لحاظ سے حاوی نہیں بھی ہوسکتے جیسا کہ مثلاً پاکستان میں۔ پاکستان میں افسر شاہانہ بورژوازی کوئی الگ سے طبقہ تو نہیں ہے لیکن یہ بہت مشکل سے وضاحت کن بوروژا حصہ ہے اس میں تمام فوجی وسول افسر شاہی شامل ہے لیکن محدود تناظر میں اس میں اعلیٰ افسر شاہی کا محض وہ حصہ شامل ہے جو سرکاری شعبے کے کارخانوں کے منافع کی تقسیم کو کنٹرول کرتا ہے اس کے علاوہ بجٹ کے ذریعہ از سر نو تقسیم ہونے والی قومی آمدنی کے ایک حصے پر قبضے کے ساتھ ہضم کردہ وسائل کا مخصوص بورژوا طریقے سے اصراف بھی منسلک ہے۔ بورژوا سماج کا دوسرا اہم طبقہ پرولتاریہ بھی پاکستان میں ساختیاتی اعتبار سے بہت پیچیدہ ہے۔ اس کی اساس فیکٹری اور کارخانے کے مزدور طبقے اور تشبیہاً فیکٹری پرولتاریہ سے قریب غیر صنعتی پرولتاریہ پر مشتمل ہے۔ اس میں اعلیٰ تنخواہ یافتہ مزدور، مستری، مکینک، پست پیشہ ورانہ مہارت کے حامل غیر صنعتی مزدور، نیم ہنرمند اور غیر ہنرمند مزدور شامل ہیں جو خصوصاً زرعی پیداوار کی پراسیسنگ کے موسمی کارخانوں میں بہت زیادہ ہیں ان کے علاوہ اینٹوں کے بھٹوں میں کام کرنے والے مزدور چھوٹے میکانکی اداروں، میکانیکی وکشاپوں، مرمت ودستی کام کے کھاتوں چھوٹے چھوٹے چھاپہ خانوں وغیرہ کے مزدور گھریلو اور حرفتی پرولتاریہ، تعمیراتی وسڑکوں اور مرمت کے کاموں میں مصروف مزدور، گھروں میں پارچہ بافی اور قالین بافی کے کاموں سے جڑے مزدور بھی پرولتاریہ کے زمرے میں آتے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ پاکستان میں تعداد کے لحاظ سے غیر فیکٹری پرولتاریہ فیکٹری پرولتاریہ سے زیادہ ہے نیم پرولتاری اور ماقبل پرولتاری پرتیں دیہی باسیوں کی بھاری اکثریت پر مشتمل ہیں مفلسین اور آوارہ گرد (لمپن) بورژوا سماج کے ساختی اگرچہ غیر بنیادی جزو کے طور پر پاکستان کے حالات میں عبوریت کی خصوصیات اور روایتی سماج کی نچلی پرتوں سے تعلق برقرار رکھتے ہیں یہاں مفلسین سے مراد وہ بیروزگار ہیں جنہوں نے ابھی روزگار کی امید نہیں کھوئی جن کا وجود اتفاقیہ آمدخیرات یا سرکاری اور سماجی امداد کے ذریعے قائم رہتا ہے ایسے مفلسین کے علاوہ پیشہ ور گداگر محنت کی صلاحیت سے کلیتاً محروم افراد وسائل زندگی سے محروم بیوائیں اور یتیم بچے بھی لمپن پرولتاریہ کے زمرے میں آتے ہیں اس کے علاوہ غیر قانونی سرگرمیوں کے حلقے میں مصروف افراد، چور بازاری اور اسمگلنگ، دلالی، قمار بازی اڈے اور قحبہ چلانے والے فحش مواد فروخت کرنے والے زیر زمین کاروبار کرنے والوں کے معمولی کارندے وغیرہ بھی لمپن پرولتاریہ کے زمرے میں آتے ہیں۔

خدمات کے شعبے سے تعلق رکھنے والے محنت کش بھی استحصال کا شکار ہونے والی ایک اہم اور بڑی سماجی پرت ہے۔ اس ضمن میں یہ بات غور طلب ہے کہ خدمات کے شعبہ سے تعلق رکھنے والے محنت کش قدر کی پیدائش یا افزائش کا سبب نہیں بنتے وہ محض ادھر کا مال ادھر کرتے رہتے ہیں۔ طبقات اور طبقاتی صورت پذیری ہی کی طرح پاکستانی معاشرے میں پائے جانے والے تضادات بھی متنوع ہیں ہر چند کہ بنیادی تضاد یہاں پر بھی محنت اور سرمائے کا ہے جس کے نتیجے میں سامراج کے ساتھ پاکستان کے مجموعی طور پر تمام محنت کشوں کا تضاد، سرمایہ داروں کے ساتھ فیکٹری وغیر فیکٹری پرولتاریہ کا تضاد جاگیردار/ بڑے زمیندار کا کسان اور اجرت پر کاشت کرنے والے محنت کش کے ساتھ تضاد وغیرہ بنیادی تضادات ہیں جنہیں حل کیے بغیر ملک میں بہتر انسانی معاشرہ قائم کرنے کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

ہر چند کہ ہمارے عہد میں سامراجی ممالک کی نو آبادیات نہیں ہیں تاہم ٹیکنالوجی اور معیشت پر اجارہ داری اور اپنی جنگی مشین کے بل بوتے پر سامراجی ممالک نے جدید نو آبادیات کا جال بچھا رکھا ہے نجی ملکیت اور طبقات پر مبنی کوئی بھی معاشرہ ہمیشہ یہی سمجھتا رہتا ہے کہ اس کی ترقی اور خوشحالی پسماندہ ممالک اور

اقوام کی بلی دے کر ہی ممکن ہوسکتی ہے۔انسانیت مل جل کر کبھی ترقی نہیں کرسکتی لہذا پاکستان میں توانائی کا بحران انفرااسٹرکچر کی عدم موجودگی نیز سول اداروں کی خستہ حالی مقامی سول وفوجی اسٹبلشمنٹ کی نااہلی اور بد نیتی کے ساتھ ساتھ سامراجی ریشہ دوانیوں بالخصوص امریکی سامراج کی ڈکٹیشن پر چلنے کا شاخسانہ ہے مذکورہ بالا تضادات میں سے سامراج کے ساتھ تضاد کو چھوڑ کر باقی تضادات کی نوعیت بنیادی اور کلیدی تو ہے لیکن یہ ابھرے ہوئے تضادات نہیں ہیں بالخصوص محنت اور سرمائے کا جو تضاد ہے اسے اجاگر کرنے کی اشد ضرورت ہے محنت کشوں کی طبقاتی تنظیمیں قائم کرنا بائیں یا زو کی سیاست کی پہچان ہوتی ہے لیکن ہمارے ملک میں بایاں بازو خواہ جس حال اور حیثیت میں بھی ہے اس طرف توجہ ہی نہیں دے رہا شاید اس لیے کہ یہ بہت مشکل اور جوکھم والا کام ہے یا شاید اس لیے بھی کہ طبقات اور طبقاتی جدوجہد کی بنیادی مارکسی تعلیمات پر اس طرح اسے اعتماد نہیں رہا اس کے برعکس بایاں بازو بھی پاپولر نعروں اور این جی اوز کی طرز پر سرگرم رہ کر خود کو زندہ رکھنے میں زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کررہا ہے۔ پاکستان میں ثانوی نوعیت کے کچھ تضادات بھی پائے جاتے ہین جو کلیدی اہمیت کے حامل نہ ہوتے ہوئے بھی آبادی کی اکثریت کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب ہیں مثلاً قوم مذہب اور فرقے کی بنیاد پر ابھرنے والے تضادات۔ یہ حقیقت ہے کہ جنہیں چھوٹی قومیں کہا جاتا ہے ان کو اپنے مالی وسائل پر اختیار حاصل نہیں ہے انہیں اپنے علاقوں پر حکمرانی کا حق حاصل نہیں ہے اسی طرح انہیں وفاق میں برابری کی بنیاد پر نمائندگی نہیں ملتی وغیرہ تاہم یہ امر بھی قابل غور ہے کہ قومی تضاد بنیادی تضاد نہیں ہوتا کہ جس کے حل ہوجانے سے طبقاتی تضاد خود بخود حل ہوجائے یا اس کے لیے راہ ہموار ہو اس سلسلے میں بنگلہ دیش کی مثال پر غور کرنا چاہیے جہاں قریب نصف صدی قبل قومی تضاد کو حل کرلیا گیا تھا لیکن طبقاتی تضاد آج بھی جوں کا توں قائم ہے بلکہ اس کی شدت میں اضافہ ہوا ہے یہی نہیں بنگلہ دیش کے بابائے قوم خود اپنے ملک کے جرنیلوں کے ہاتھوں جس سفاکانہ طرز پر قتل کیے گئے اس سے یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ قومی تضاد بنیادی اہمیت کا حامل نہیں ہوتا۔ مذہب کی بنیاد پر نہ صرف مسلم اور غیر مسلم کا تضاد موجود ہے بلکہ مسلمانوں کا ایک فرقہ دوسرے فرقوں سے جس طرح تضاد میں ہے اور ان کے خون کا پیاسا بنا ہوا ہے اور جسے متعدد ریاستی اداروں کی پشت پناہی حاصل ہے اس تضاد کو ہر چند کہ غیر بنیادی لیکن بہت زیادا بھار کر پیش کرتی ہے اسی طرح ثانوی حیثیت کے حامل کچھ دیگر تضادات بھی پائے جاتے ہیں جیسا کہ صنعتی تضاد جو بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ نظام کا خاصہ ہے کیونکہ سرمایہ داری سوائے منافع کے کسی اور چیز کو دیکھنے سے قاصر ہوتی ہے لہذا سرمایہ دارانہ معاشرے میں خواتین اور بچے بھی ایک بکاؤ جنس کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے سرمایہ دارانہ نظام ان کی تپلی سماجی ومعاشی حیثیت کی بنا پر ان کا شدید استحصال کرتا ہے۔

پاکستان میں خواتین اور بچوں کے حقوق کے حوالے سے سب سے زیادہ بڑ بولے یعنی این جی اوز ہی ان کا سب سے زیادہ استحصال کرتی ہیں ملک میں صنفی تضاد کو حتمی طور پر حل ہونے میں تو ابھی کافی وقت لگے گا لیکن بائیں بازو کی سیاست کے ایک اہم حصے کے طور پر اس کو قبول کرنے کے باوجود بائیں بازو کی سیاست میں خواتین کی نہ کے برابر شرکت سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ ابھی طویل مسافت طے کرنی ہے اس ناکامی کی بنیادی وجہ صنفی تضاد کو طبقاتی تناظر سے آزاد ہوکر دیکھنے کی عادت ہے ایسا کرنے کا لازمی نتیجہ عورت کی اس سماجی و معاشی نظام کے خلاف لڑائی کے بجائے مردوں کے خلاف ان کی لڑائی کا بن جانا جو ایک بے نتیجہ اور عبث لڑائی بن جاتی اور معاشرے میں اس کی کوئی پذیرائی نہیں ہوتی۔

کیا کرنا چاہیے؟؟

پاکستانی بائیں بازو کو بھی باقی دنیا کی طرح بنیادی طور پر محنت کش طبقات کی شعوری سطح بلند کرنے اور ان کی طبقاتی تنظیمیں مستحکم کرنے پر سب سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے بائیں بازو کی سیاست کا انحصار پرولتاری طبقے پر ہونا چاہیے اس کے بعد سماج کے ان غیر پرولتاری حصوں پر توجہ مبذول کرنی چاہیے جو استحصال کا شکار ہوتے ہوئے بھی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کیے ہوئے ہیں روزمرہ کے مسائل پر سیاست ضرور کرنی چاہیے لیکن فقط یہی سیاست نہیں کرنی چاہیے کم از کم نکات پر اتفاق کی صورت میں بھی اتحاد قائم کیے جائیں لیکن صرف اتحادوں کے بل بوتے پر زندہ رہنے کی سعی نہیں کرنی چاہیے عوامی اجتماعات اور مظاہرے بھی منظم کرنے چاہئیں مقامی حکومتوں کے انتخابات میں حصہ لینا چاہیے لیکن کارکنوں کی نظریاتی اور سیاسی تربیت اور کردار سازی کا کام بھی جاری رکھنا چاہیے تاکہ سیاست برائے سیاست نہیں بلکہ سیاست برائے سوشلزم ہو۔

☆.....☆

میڈیا کی آزادی

ڈاکٹر توصیف احمد خان

حکومت نے میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی کے قیام پر غور شروع کر دیا ہے۔ اس خبر نے جمہوری اداروں کے استحکام کے لیے میڈیا کی آزادی پر یقین رکھنے والوں کو تشویش میں مبتلا کر دیا اور یہ تصور مزید تقویت پا گیا کہ میڈیا کے موجودہ بحران کی بنیادی وجہ آزادءِ صحافت پر نئی پابندیاں عائد کرنا ہے۔

اخبارات کے احتساب کے لیے 2002 میں قائم کیے جانے والے ادارے پریس کونسل کے اراکین کو ملنے والے ایک مسودہ قانون کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان پرنٹ میڈیا اتھارٹی کے نام سے ایک نیا سرکاری ادارہ قائم ہوگا۔ یہ ادارہ اخبارات، ریڈیو، ٹیلی وژن اور ڈیجیٹل میڈیا کو لائسنس جاری کرے گا۔

اس ادارے کے قیام سے پریس کونسل آف پاکستان آرڈیننس، پریس نیوز پیپر، نیوز ایجنسی، بکس رجسٹریشن آرڈیننس اور پیمرا آرڈیننس کالعدم ہو جائیں گے، یوں نیا قانون میڈیا کے تمام ستونوں کو ریگولیٹ کرے گا۔ مسلم لیگ کے سابقہ دور میں بھی ایسے ہی ایک قانون کا مسودہ پریس کونسل کے اراکین کو منظوری کے لیے بھیجا گیا تھا مگر پریس کونسل کے اراکین نے اس مسودے کو آئین کے آرٹیکل 19 سے متصادم قرار دیا تھا اور مسلم لیگ ن کی حکومت کے ذمے داروں نے موقف اختیار کیا کہ وہ اس اہم قانونی مسودے سے لاعلم تھے۔ ایک افسر کو معطل بھی کیا گیا تھا۔ مسلم لیگ کے دورِ حکومت کے اختتام تک یہ مسودہ کسی فائل کے نیچے محفوظ کر دیا گیا، مگر تحریک انصاف کے حکومت میں آنے کے بعد اب یہ اطلاعات ہیں کہ پریس کونسل کو ختم کرنے کے بارے میں کسی اعلیٰ سطح کے اجلاس میں غور و فکر ہوگا۔

پاکستان میں میڈیا شدید بحران کا شکار ہے۔ ایک طرف ڈالر کی قیمت بڑھنے سے نہ صرف پرنٹ بلکہ الیکٹرانک میڈیا کا خسارہ بھی بڑھ گیا ہے تو دوسری طرف حکومتی پالیسی کے باعث میڈیا کے تمام ستون ایک نئے قسم کے اقتصادی بحران میں مبتلا ہیں۔ ملک کے بڑے شہروں کے پریس کلب میں بیروزگار صحافیوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ پاکستان میں دہشتگردی اور ٹارگٹ کلنگ میں ہلاک ہونے والے صحافیوں کی تعداد دنیا کے بہت سے ممالک کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ اب نئی صورتحال صحافیوں میں مزید مایوسی پیدا کر رہی ہے۔

میڈیا کی آزادی کو پابند کرنے کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں اخبارات جاری ہوئے۔ پہلے کمپنی کے ملازمین نے انگریزی اخبارات جاری کیے، پھر مقامی زبانوں میں اخبارات شایع ہونے لگے۔ تب کمپنی کے اہلکاروں نے محسوس کیا کہ اب مقامی اخبارات ہندوستان کی رائے عامہ کو متاثر کر رہے ہیں تو 1822 میں لائسنس کا قانون نافذ ہوا۔ اس قانون کے تحت پرمٹ کے بغیر اخبار کی اشاعت کو جرم قرار دیا گیا۔

اس قانون میں اخبارات کو شایع کرنے پر اخبار پر ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر کے نام اور دفتر کا پتہ شایع کرنے کی پابندی عائد کی گئی۔ معروف ریفارمر راجہ موہن رائے جو ہندی اور دیگر زبانوں میں اخبارات شایع کرتے تھے نے اس قانون کو ہندوستان کے شہریوں کی تذلیل قرار دیا۔ انھوں نے کلکتہ کی انگریزی عدالت میں اس قانون کو چیلنج کیا۔ پھر یہاں سے مایوس ہو کر وہ لندن گئے اور برطانیہ کی سب سے بڑی عدالت پریوی کونسل میں ایک پٹیشن دائر کی۔

اس پٹیشن میں کہا گیا تھا کہ برطانیہ میں شہریوں اور اخبار کی اشاعت کے لیے کسی پرمٹ یا لائسنس کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اخبار کو شایع ہونے سے پہلے سرکاری افسر سے سنسر کرایا جاتا ہے تو پھر ہندوستان کے شہریوں سے یہ حق کیوں چھینا گیا؟ پریوی کونسل نے راجہ صاحب کی اس پٹیشن کو اس دلیل کے ساتھ مسترد کر دیا کہ برطانیہ کے شہریوں اور کالونی کے شہریوں کے حقوق یکساں نہیں۔ راجہ صاحب نے اس موقعے پر تاریخی اعلان کیا کہ پرمٹ حاصل کرنے اور اخبار کو سنسر کرانے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ اخبار کو بند کر دیا جائے۔

کچھ عرصے بعد صحافیوں کے احتجاج پر کمپنی کی حکومت نے قانون میں تبدیلی کی اور پرمٹ کی جگہ ڈیکلریشن کا لفظ استعمال کیا مگر حکومت کی جانب سے

ڈیکلریشن کی تصدیق تک اخبار کی اشاعت کو فوجداری جرم قرار دیا گیا۔ برطانوی ہند حکومت نے پریس پر کنٹرول کرنے کے لیے مزید سخت قوانین نافذ کیے۔ ان قوانین میں 1822 کے قانون کی شقیں ہر صورت میں شامل رہیں۔ برطانوی دورِ حکومت کا 1931 کا پریس ایکٹ ایک سیاہ قانون کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔

بدقسمتیہ ہے کہ آزادی کے بعد پاکستان میں اس قانون کو استعمال کیا جاتا رہا۔ جنرل ایوب خان حکومت نے 1963 میں پریس اینڈ پبلکیشنز آرڈیننس (P.P.O) ترمیم کے ساتھ نافذ کیا۔ اس قانون میں کمپنی کی حکومت سے لے کر برطانوی ہند حکومت کے دور کے تمام متنازعہ قوانین کو سمو دیا گیا تھا۔ تمام اخباری مالکان، ایڈیٹروں اور صحافیوں نے اس قانون کے خلاف طویل جدوجہد کی۔ اپوزیشن کی جماعتوں نے اس قانون کو سیاہ قانون قرار دیا۔

جنرل ضیاء الحق کے دور میں وفاقی شریعت کورٹ نے پی پی او کی بعض شقوں کو غیر اسلامی قرار دیا۔ سابق وزیراعظم محمد خان جونیجو کے دور میں ایک نیا مسودہ تیار کیا۔ غلام اسحاق خان کی عبوری حکومت نے پی پی او منسوخ کیا اور رجسٹریشن آف پریس اینڈ پبلکیشنز آرڈیننس نافذ ہوا۔ اخبارات کے ڈیکلریشن کا طریقہ آسان ہوا، مگر 1988 سے 1999 تک قائم ہونے والی حکومتیں اس آرڈیننس کو پارلیمنٹ سے منظور کرانے میں ناکام ہوئیں۔

جنرل پرویز مشرف کے دور میں نجی شعبے میں ریڈیو اور ٹیلی وژن چینلوں کے قیام کا سلسلہ شروع ہوا۔ مشرف دور کے قوانین بہت زیادہ برے نہیں ہیں مگر یہ قوانین آئین کے آرٹیکل 19 اور 19-A کی مکمل طور پر پاسداری نہیں کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ صحافی، ایڈیٹر اور سول سوسائٹی کے اراکینیہ مطالبہ کرتے رہے کہ ان قوانین کو مزید بہتر بنایا جائے مگر ان قوانین کو مزید بہتر بنانے کے بجائے ایسٹ انڈیا کمپنی کے قانون کو ایک نئی شکل میں نافذ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ انسانی حقوق کی تحریک کے کارکن آئی اے رحمٰن نے لکھا ہے کہ پہلے سول سوسائٹی کو مفلوج کیا گیا اور اب میڈیا کو کمزور کیا جا رہا ہے جس کا سارا نقصان عوام کا ہے۔☆☆

پاکستان میں طبقاتی ڈھانچہ اور بیسویں صدی کے سوشلسٹ اور ٹیکنالوجی انقلاب کے اثرات

انجینئر حیدر زماں

ہر چند کہ تاریخی طور پر طبقاتی ساخت کے کلاسیکی معنی مزدور (صنعتی) کسان، جاگیردار، سرمایہ دار لیا جاتا ہے لیکن پاکستان کے سماج میں ان طبقات کی حدود اور سماجی ساخت پیداواری رشتوں کے حوالے سے اتنے واضح نہیں اس بات کا ادراک کارل مارکس نے بھی اپنی تصنیف The Asian mode of productions میں کیا تھا۔

کارل مارکس نے برصغیر کے Village Organization کو انسانی سماج کا ایک انوکھا تجربہ گردانا تھا جس کے اندر انسانوں کے گروہ کاشتکاری کے ساتھ ساتھ پیشوں کے لحاظ سے منسلک تھے جولاہے، ترکان، موچی، لوہار، چمار، مذہبی پیشوا اپنی خدمات کے بدلے اناج وصول کرتے تھے

مختلف دیہات کو ملا کر ریاست ایک جمعدار اور اوپر صوبیدار مقرر کرتا تھا جو کسانوں سے لگان وصول کر کے ریاست کے حوالے کرتا تھا لیکن جمعدار یا صوبیدار کو ملکیتی زمین حاصل نہ تھی وہ صرف زمین کی حاصلات کا وقتی طور پر قابض تھا اور بادشاہ کے لیے گھوڑے وغیرہ فراہم کرتا تھا۔ برطانوی حکومت کا 1857 کی جنگ آزادی کے بعد زمین کا بندوبست Land settlement کے نتیجے میں برصغیر کے اندر جاگیرداروں نوابوں, وڈیروں اور سرداروں کا جنم ہوا لیکن گاؤں کی سماجی ساخت کم و بیش لمبے عرصے تک برقرار رہی۔ ہر چند کہ انگریزوں نے کلکتہ، بمبئی، مدراس اور وسطی علاقے احمد آباد وغیرہ میں اسٹیل اور ٹیکسٹائل کے کارخانے لگوانے میں مدد دی ہندوستان میں ریلوے کا عظیم جال بچھایا گیا اور بندرگاہوں خصوصی طور پر بمبئی کلکتہ مدراس کے اندر گودیاں قائم کی گئیں۔ ان اقدامات سے ہندوستان میں صنعتی مزدور اور گودی کے مزدور پیدا

ہوئے اس کے علاوہ ہندوستان کے دریاؤں سے نہروں کا ایک جال بچھایا گیا جس کے نتیجے میں زرعی پیداوار میں انقلابی اضافہ ہوا اور اس کے نتیجے میں کسان طبقہ، جاگیردار طبقہ اور غلہ منڈیاں وجود میں آئیں۔

البتہ موجودہ (مغربی پاکستان) کے قبائلی علاقے اور بلوچستان کے زیادہ تر علاقے قبائلی سماج اور سرداری نظام میں بدستور جکڑے رہے۔

یہ پس منظر بیان کرنا اس لیے ضروری تھا کہ یہ تاریخی وہ بنیاد ہے جس پر ہمارے آج کے طبقات کم وبیش وجود میں آئے ہیں اور خصوصی طور پر کسانوں اور مزدوروں کے نفسیات اور رسم ورواج کا پتہ دیتے ہیں۔

ریلوے، نہر کاری کے علاوہ مغربی پاکستان میں انڈسٹری نہ ہونے کے برابر تھی اور کراچی بندرگاہ کی بھی ۱۹۴۷ء کے بعد ہی توسیع ہوئی ہے۔

۱۹۴۷ کے بعد پاکستان کے وجود میں آنے بعد مغربی سامراج خصوصاً NATO کو اس ملک کی زبردست ضرورت محسوس ہوئی چونکہ پاکستان وہ روٹ تھا جو روس کو گرم پانیوں (بحرہ عرب اور بحر ہند) تک رسائی دے سکتا تھا چنانچہ امریکہ نے ٹھان لی کہ اس ملک کی نوکرشاہی (بیوروکریٹس) اور مسلح افواج کو ترقی یافتہ بنائیں اس سلسلے میں Seato اور Cento پلان کے ذریعہ بیوروکریسی اور فوج کو نہ صرف تربیت دی بلکہ ہر قسم کے جدید ہتھیاروں سے لیس کیا تاکہ وہ کمیونزم کے آگے ایک آہنی دیوار بن سکے۔ اس کے ساتھ مغربی دنیا نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ کمیونزم کے آگے بند باندھنے کے لیے پاکستان کا مذہبی ریاست ہونا لازم ہے چنانچہ آئین پاکستان کو بھی ابتدا سے اس مقصد کے لیے تیار کیا گیا اور ملک کے اندر مذہبی عسکریت کی داغ بیل ڈال دی گئی۔

ٹریڈ یونین تحریک کو سبوتاژ کرنے کے لیے جہاں تشدد، لاقانونیت کا بے دریغ استعمال کیا گیا وہاں پاکٹ یونین کو متعارف کرایا گیا تاکہ مزدوروں، کسانوں کو حقیقی لیڈرشپ ہی نہ مل سکے۔ یو این او کے ذیلی اداروں آئی ایل او وغیرہ نے اس عمل میں بھرپور ساتھ دیا۔

۱۹۸۶ء کے ملک بھر کے مزدور طالب علم ابھار کو نہ صرف کامیاب ہونے نہ دیا گیا بلکہ عوام الناس جھوٹے وعدوں اور وقتی فائدوں کے فریب میں گرفتار ہوئے اور نقلی لیڈرشپ کے دام کے اسیر ہوئے۔ بائیں بازو کے کارکنان کی آپس میں نااتفاقی اور غلط سیاسی تجربے بھی اس ناکامی کے ذمہ دار ہیں

پاکستان میں انڈسٹری برائے نام ہونے اور اس میں خاطر خواہ جدیدیت نہ ہونے کے باعث بیرونی اشیاء کی درآمد جاری رہی خصوصی طور پر الیکٹرانک اشیاء جاپان ملائیشیا سنگاپور اور چین سے درآمد ہوتے ہیں ملکی انڈسٹری انکا مقابلہ معیار اور دام کے لحاظ سے نہیں کر پارہی لہذا زیادہ تر تجارت بیرون ملک سے درآمد شدہ اشیاء کی ہماری مارکیٹوں میں جاری ہے۔ اس سے دو باتیں واقع ہوئیں۔ ا۔ ہمارے ملک کی آبادی زیادہ تر کنزیومر معاشرہ بن گئی ہے اور ہمارے زیادہ تر لوگ ٹریڈرز کلاس میں تبدیل ہوگئے ہیں ٹریڈرز کلاس کی اپنی نفسیاتی ساخت اور اپنی سیاست ہے چونکہ یہ لوگ زیادہ تر شہروں اور قصبوں میں آباد ہیں اور پاکستان کی موجودہ سیاست پر شہر اور قصبوں کا قبضہ ہے لہذا سیاست میں بھی ٹریڈرز کلاس چھائی ہوئی ہے۔

۳۔ پاکستانی سیاست میں قومی سوال بھی بہت اہم ہے پختون، بلوچ، سندھی، سرائیکی سب محرومی کا شکار ہیں آئین پاکستان میں وفاقی ڈھانچے کے باوجود ان شقوں پر عمل نہیں ہورہا C-C-I,I.R.S.A اور دوسرے وفاقی آئینی اداروں کی بات نہیں مانی جاتی اور صوبوں کو ان کے وسائل پر اختیار نہیں دیا جاتا یہاں تک کہ صوبائی حکومتیں اسلام آباد کے آگے بے بس نظر آتی ہیں۔ ان کے کلچر اور تاریخ کو وفاقی مین اسٹریم سے باہر رکھا جاتا ہے تعلیمی نصاب میں قومیتوں کے ہیروز کو یکسر نظر انداز کردیا جاتا ہے۔

ایسے میں تمام قومیتیں محرومی اور احساس کمتری کا شکار ہیں اور ان کا تضاد پنجاب اور اسلام آباد سے بنتا ہے۔ درمیانی اور ادنیٰ درمیانی طبقہ کے نوجوانوں میں ان سے نفرت اور غصے کے جذبات ہیں۔

ان حالات کے پیش نظر میرے اندازے میں پاکستان کے سماج میں اندرون مندرجہ ذیل تضادات موجود ہیں میں فی الحال سامراج کے ساتھ تضاد کو نہیں لیتا۔

ا۔ جمہوریت کا تضاد:۔ جو کہ شہروں کے ادنیٰ درمیانی طبقے اور درمیانہ طبقہ کا آمریت (Establishment) کے خلاف ہے ہر چند کہ الیکٹرونک میڈیا اس کو کوئی اور رخ دینے کی سعی کررہا ہے لیکن ان طبقات میں یہ جذبات بدرجہ اتم

موجود ہیں جو کسی وقت بھی برسرِ زمین Surface پر آ سکتا ہے۔

۲۔قومیتی تضاد: جو چھوٹے صوبوں کے ادنیٰ درمیانہ اور درمیانہ طبقات کا وفاقی حکومت اور اسٹیبلشمنٹ سے ہے اور نوجوان گاہے بہ گاہے اس کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

۳۔محنت کا تضاد: ہر چند کہ پاکستان کے مزدور طبقے اور کسانوں کا غیر انسانی استحصال ہو رہا ہے لیکن ٹریڈ یونینز اور کسان تحریکوں کے منظّم نہ ہونے کی وجہ سے میرے اندازے میں یہ تضاد تیسرے نمبر پر ہے بین الاقوامی اقتصادی حالات کی وجہ سے مجھے نہیں لگتا کہ پاکستان کی مینوفیکچرنگ انڈسٹری میں مستقبل قریب میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا یا جس کے نتیجے میں صنعتی مزدوروں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہونے کا امکان ہوگا اس لیے محنت کا تضاد ثانوی حیثیت ہی میں آئندہ چند دہائیوں تک برقرار رہے گا۔ یہی حال کسان تحریک کا ہوگا البتہ شہری بیروزگار چھوٹے کاروباری اور شہری مزدوروں کو منظّم کرنے کا وقت آ گیا ہے اور پارٹی کو ان گروہوں کو منظّم کرنے کی کوششیں کرنی چاہئیں۔

بیسویں صدی کے سوشلسٹ انقلابات

ٹیکنالوجی انقلاب کے اثرات

یوں تو بیسویں صدی میں پہلا سوشلسٹ انقلاب ۱۹۱۷ء میں روس میں بالشویک پارٹی کی قیادت میں برپا کیا گیا پارٹی کا رہنما' وی آئی لینن تھا اسکے بعد ایشیا میں ۱۹۴۹ء میں چین میں کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں جس کی رہنمائی ماؤزے تنگ اور اس کے رفقاء کار کر رہے تھے میں انقلاب کامیاب ہوگیا اس کے بعد تو انقلابات کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا جس میں قابل ذکر کیوبا کا انقلاب ہے جس کی قیادت فیڈل کاسٹرو اور چے گویرا اور ساتھیوں نے کی دوسری جنگ عظیم کے دوران پورا مشرقی یورپ جس میں رومانیہ' بلغاریہ' ہنگری' چیکوسلواکیہ' یوکرین مشرقی جرمنی' پولینڈ' یوگوسلاویہ اور البانیہ میں سویت افواج کی مدد سے سرمایہ دارانہ حکومتوں کے تخت الٹ دیے گئے مشرق میں ویت نام میں کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں ہوچی منہ نے کی اور کمبوڈیا لاؤس میں بھی ویٹکانگ نے امریکی سامراج کو شکست دے کے سوشلسٹ حکومتیں قائم کی گئیں۔

اگر اختصار سے کام لیا جائے تو روس میں انقلاب کی قیادت صنعتی مزدوروں نے کی البتہ سپاہیوں اور کسانوں نے ان کی مکمل حمایت کی ۱۹۱۷ء میں زار شاہی کا تختہ الٹنے کے بعد تقریباً چودہ سامراجی ممالک نے روسی سرزمین پر سات آٹھ محاذوں پر سرخ فوج پر حملے کیے۔ ملک کے اندر سازشوں بیرونی سرمائے اور ہتھیاروں کے ذریعے سے نوابوں سے بغاوت کرائی گئی اور یوں روسی عوام اور بالشویک پارٹی ایک سخت ترین امتحان سے تقریباً چھ یا سات سال تک نبرد آزما رہے تب جا کر سامراجی حملہ آوروں کے حوصلے پست ہوئے اور روس کے طول و عرض پر سرخ فوج کی عملداری قائم ہوئی۔

سوویت روس: چونکہ عالمی دنیا میں سوشلسٹ سماج قائم کرانے کی پہلی کوشش تھی لہذا سرمایہ داری اور سامراج کی آنکھوں میں یہ ایک کانٹا تھا جس کے خلاف ساری سرمایہ دار دنیا نے ایک محاذ بنائے رکھا۔ اگر بالشویک پارٹی کی بے لوث اور قابل افراد کی بڑی کھیپ کی قیادت نہ ہوتی تو سویت انقلاب کی کونپل کو چٹکنے سے پہلے ۱۹۳۰ء میں مسل دیا جاتا۔

۱۹۱۷ کے انقلاب کا ایک ثمر سوویتوں کا نظام تھا جس کے تحت مختلف علاقوں کو ان کی طبقاتی ہیئت' کلچر اور ثقافت کی بنیاد پر تنظیمی ڈھانچوں میں تقسیم کیا گیا اجتماعیت کا فائدہ اٹھا کر بہت کم عرصے میں ایک پسماندہ پیداواری سماج کو اعلیٰ پیداواری سماج میں تبدیل کیا گیا اسٹیل اور مشینری بنانے کے کارخانے جگہ جگہ قائم کیے گئے اور قحط زدہ روس زرعی پیداوار میں دنیا کے سرفہرست ممالک میں آ گیا ہر چند کہ روسی سماج میں سوشلزم کے خدوخال نمایاں ہونے لگے لیکن یہ باور کرانا کہ طبقاتی سوسائٹی کا قلع قمع کیا گیا غلط تھا۔

اس اثنا میں ہٹلر (جرمنی) نے جنگ عظیم دوم برپا کی اور ۱۹۴۱ء میں سوویت یونین پر اپنے تمام فاشسٹ افواج کی یلغار کی سوویت یونین اس اچانک آفت سے نبرد آزما ہوئی اور اس جنگ آزادی میں روس کے دو کروڑ لوگ کام آئے کمیونسٹ پارٹی اور سرخ فوج کے قابل ترین افراد اس جنگ میں لقمۂ اجل بن گئے اور کمیونسٹ پارٹی نظریاتی طور پر انتہائی کمزور ہوگئی اور پارٹی قیادت پر موقع پرستوں اور عوام دشمن لوگوں کا قبضہ ہوگیا جو بالآخر سرمایہ داری کی بحالی کا باعث بنا۔

۲۔چین کا انقلاب: کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی قیادت میں کسانوں کے

لانگ مارچ کا نتیجہ تھا پہلے وہ جاپانی نو آبادیاتی نظام سے نبرد آزما ہوئے اور بعد میں چینی مطلق العنان حکمران چیانگ کائی شیک کی افواج جن کو یو ایس کی مکمل حمایت حاصل تھی سے لڑائیاں لڑنی پڑیں جس کے نتیجے میں چین کے طول وعرض پر قبضہ کر کے اس کو پیپلز ری پبلک آف چائنا کا نام دیا۔ چینی معاشرہ انتہائی پسماندہ' افیون کا دلدادہ اور قحط زدہ تھا کھانے پینے کا سارا دارومدار اناج درآمد کر کے بمشکل پورا کیا جاتا تھا ماؤزے تنگ نے سب سے پہلے نعرہ غذائی خود کفالت کا لگوایا اور سطح زمیں چاہے وہ پہاڑ ہوں' میدان یا دریاؤں کی گزرگاہ سب پر چاول اور اناج اگوا کر چین کو غذائی طور پر خود کفیل بنا دیا۔ اس کے بعد سوویت یونین کی مدد سے ہیوی انڈسٹری کا آغاز کیا اس میدان میں بھی سرعت سے کامیابیاں حاصل کیں۔

چینی کمیونسٹ پارٹی نے سماج میں ثقافتی انقلاب کی ضرورت کی بھی نشاندہی کی ان کا کہنا تھا کہ اگرچہ سرمایہ داری کو پہلے مرحلے میں شکست ہوئی ہے لیکن بورژوا سوچ ابھی افراد میں موجود ہے اگر اس کا ثقافتی سطح پر تدارک نہ کیا گیا تو سرمایہ داری دوبارہ بحال ہوسکتی ہے۔

اگرچہ چین میں ثقافتی انقلاب بھونڈے طریقے سے نافذ کیا گیا جس کا معاشرے کو فائدے کی بجائے نقصان ہوا اور عوام آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔

ماوزے تنگ اور اس کے ساتھی چواین لائی وغیرہ کی وفات کے بعد چینی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی قیادت نئے لوگوں نے سنبھالی جن میں ڈینگ زاو پنگ کا نام قابل ذکر ہے ڈینگ نے چین میں مارکیٹ اکانومی کو رائج کیا جس کے تحت چین میں آزاد منڈی کو رواج دیا اور بیرونی فرموں کو اجازت دی کہ وہ چین کے اندر صنعت لگا سکتے ہیں اور کاروبار کر سکتے ہیں البتہ یہ تمام کاروبار کمیونسٹ پارٹی کی چھتری تلے اور سپرویژن کے اندر ہوگا ڈینگ نے بین الاقوامی تجارت کو ترجیح دی ان اقدامات سے چین میں بیرونی سرمایہ کا ارتقا شروع ہوا اور سرمائے میں اتنی بڑھوتی ہوئی کہ وہ ایشیا کی سرحدوں سے یورپ اور امریکہ تک پھل گیا چینی اقتصادیات میں تعجب خیز اضافہ ہوا اور اقتصادی طور پر چین یورپ اور امریکہ کو پیچھے چھوڑ گیا چینی سرمایہ نے یورپ اور امریکہ کے اندر مارکیٹوں پر قبضہ کیا خصوصی طور پر روزمرہ استعمال کی چیزوں پر تو چینی مال چھا گیا چینی سماج کے اندر بھی سرمایہ دارانہ تعلقات اور اس کے برے اثرات جیسے رشوت کرپشن اقربا پروری دیکھنے میں آئی ہیں۔

بعینہ یہی صورت حال ویت نام لاؤس اور کمبوڈیا میں بھی پیدا ہوئی اگرچہ عام لوگوں کا معیار زندگی بہت بہتر ہوا لیکن بیرونی سرمایہ کاری کے ساتھ وہ تمام قباحتیں درآمد ہوئیں جو سرمایہ دارانہ نظام کا منطقی نتیجہ ہوتی ہیں اگرچہ کیوبا کی حکومت نے اتنی سرعت کے ساتھ مارکیٹ اکانومی کو نہیں اپنایا پھر بھی کیوبا میں بھی چھوٹے کاروبار اور پرائیویٹ بین الاقوامی تجارت کی اجازت مل گئی ہے تاہم اوپر ذکر کیے گئے تمام ملکوں میں کمیونسٹ پارٹی کی حکومتیں قائم ہیں اور یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ وہاں سرمایہ داری بحال ہوئی ہے۔

۳۔ ٹیکنالوجی انقلاب کے اثرات

انیسویں صدی یورپ اور امریکہ کے اندر میکینکل ٹیکنالوجی اور اس سے جڑی ہوئی ایجادات کا زمانہ تھا اگرچہ الیکٹریکل ٹیکنالوجی بھی اس کی ہم رکاب رہی لیکن ساری ایجادات کا رخ دھات سے Alloy بنانے اور میکینکل Automation کی طرف تھا تاکہ مشینوں میں آٹومشین کر کے ان کی استعداد کو کئی گنا بڑھایا جاسکے اور پیداوار میں اضافہ ہو اس طرح کیمیکل ٹیکنالوجی بھی جدت سے ہمکنار ہوئی اور Metallurgy میں نوع بہ نوع اضافے ہوئے۔

تاہم پہلی جنگ عظیم (1914-1918) اور دوسری جنگ عظیم (1939-1945) میں جب افرادی قوت زیادہ تر محاذ پر بھیج دی گئی ضرورت محسوس کی گئی کہ انسانی مدد کے بغیر خودکار مشینوں کو ایجاد کیا جائے بیسویں صدی کے وسط تک ریموٹ کنٹرول وائرلیس اور الیکٹرانک کنٹرول کا استعمال عام ہو گیا تھا جب کمپیوٹر کی ترقی ہوئی تو انسانی Muscle power کے ساتھ ساتھ دماغی پاور کی بھی چنداں اہمیت باقی نہیں رہی خصوصاً پیداواری صنعتوں کے اندر جس کارخانے کو دس بیس ہزار مزدور چلاتے تھے کمپیوٹر آٹومشین کی بدولت وہ چند سو افراد کے قبضہ قدرت میں آ گئے اس کے بعد روبوٹ کا استعمال شروع ہوا جس نے انسانی محنت اور ذہنی ضرورت کو بھی اضافی قرار دیا۔

چونکہ ''لیبر'' کا تصور سرمایہ دار اور صنعت کار کو ہمیشہ ٹریڈ یونین ہڑتال اور انقلاب کا ڈراوا دیتا ہے لہذا روبوٹ اور آٹومیشن اس کے دماغ پر چھایا ہوا ہے اور وہ ہر قیمت پر لیبر کے اجتماع سے جان چھڑانا چاہتا ہے تاہم سرمایہ دار کے لیے

سانحہ یہ بھی ہے کہ روبوٹ اور آٹومیشن بہت مہنگا پڑتا ہے اور یہ چیزیں بھی انسانی دماغ اور کہیں محنت کی ہی پیدا کردہ ہیں مزید برآں ان کے سپیئرز بھی بہت مہنگے ہوتے ہیں جو لاگت میں اضافہ کرتا ہے اب کارخانوں پیداواری یونٹوں میں اگرچہ مزدوروں کی تعداد گھٹ کر 1/5 یا 1/10 رہ گئی لیکن کام کرنے والے ہاتھ سادہ مزدور کے نہیں بلکہ ٹیکنالوجسٹ' ڈپلوما ہولڈر' تربیت یافتہ مزدور اور انجینئر کی تعداد بڑھا گیا جن کے معاوضے بھی سادہ مزدور کے مقابلے میں پانچ گنا' دس گنا اور بعض اوقات اس سے زیادہ ہوتے ہیں۔

ان پیداواری یونٹوں میں بلیو کالر مزدور کے بجائے وائٹ کالر مزدور نے لے لی ہے جس کی نفسیاتی ساخت (یلو کالر' بلیو کالر) مزدور سے مختلف ہے اور وہ زیادہ آسودہ حال ہے اگرچہ اس کی ضروریات زندگی میں بھی عام مزدور سے کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔

مارکسسٹوں کے لیے سوچنے کا مقام ہے کہ آج کل کی دنیا میں انقلاب کا ہراول دستہ کون سا طبقہ ہوگا؟ ترقی پذیر دنیا کے سماج میں کیا کسان جو کارپوریٹ فارمنگ کا ملازم ہوگا یا شہری بیروزگار (lump Proltriet) یا وہ مزدور جو مستقل ملازم نہ ہو بلکہ روزانہ اجرت پر کام کر رہا ہو یا ادنیٰ درمیانی طبقہ سے تعلق رکھنے والا دانشور جس نے محنت کشوں کی بالادستی ذہنی طور پر اختیار کی ہوئی ہو؟

جدید ٹیکنالوجی نے پیداواری عمل میں انقلاب برپا کیا وہ اشیاء جو پہلے ہزاروں میں بنتی تھیں اب لاکھوں میں بننے لگیں اس سے ایک طرف پیداواری لاگت میں کمی ہوئی تو دوسری جانب ان اشیاء کی کھپت کے لیے نئی منڈیوں اور نئے کنزیومرز کو حاصل کرنے کا مقابلہ شروع ہوگیا ذرائع حمل ونقل میں بے پناہ ترقی اور نئے نئے شاہرات نے اس کام کو ممکن بنادیا چنانچہ دنیا میں Containerization کا ایک نیا دور شروع ہوا جس نے بین الاقوامی تجارت اور دور دراز مقامات تک اشیاء کی ترسیل کو آسان کردیا اس کے ساتھ ساتھ گاڑیوں ریلوں اور ہوائی ٹرانسپورٹ پر کام کرنے والے لاکھوں افراد اس مد میں روزگار پانے لگے۔

بین الاقوامی طور پر پیداور کی اس نوعیت نے دنیا کو دو حصوں میں تبدیل کردیا ہے ایک وہ خطے جو قدرتی وسائل اور خام مال سے مالا مال ہیں لیکن ٹیکنالوجی اور صنعت وحرفت میں پیچھے ہیں دوسرے وہ علاقے جن کی آبادی تعلیم اور ٹیکنالوجی میں آگے ہیں تمام ترقی یافتہ دنیا Technology Transfer کے معاملے میں بہت کنجوس ہے اور اس کو صیغہ راز میں رکھتی ہے۔

سرمایہ دار ممالک چاہتے ہیں کہ ترقی پذیر ممالک صرف خام مال پیدا کریں اس کو ترقی یافتہ ممالک کو اونے پونے دام خرید کر اس میں Vallue addition کرے اور واپس کنزیومرز کو سونا لاگت پر فروخت کرے۔

☆☆☆

جنگ صرف طبقاتی جنگ

صباالدین صبا

سویت یونین کے انہدام پر سوشلزم کے خاتمے سرمایہ داری کی حتمی فتح انسانی تہذیب کی تکمیل اور واحد سپر پاور کی حیثیت سے بالادستی کے امریکی حکمرانوں کے تمام دعوے ہوا ہو چکے ہیں۔ 2008 میں جرمنی سے شروع ہونے والے عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے بحران نے پوری سرمایہ دارانہ معیشت کو زوال پذیری کا شکار کردیا ہے۔ اور امریکی ماہر اقتصادیات والراسٹین کے مطابق عالمی سرمایہ دارانہ نظام ڈھانچہ جاتی (ناقابل حل) بحران سے دوچار ہوگیا ہے۔ خود سرمایہ دارانہ معاشرے کے ماہرین، دانشور متبادل عالمی نظام کی تلاش میں سرگرداں ہیں آج کا اہم ترین سوال یہ ہے کہ آیا بایاں بازو عالمی سطح پر متبادل کے طور پر خود کو تسلیم کرواسکتا ہے؟۔

اس تناظر میں برتر بین الاقوامی رجحان کا تعین کرنے اور خاص طور سے اپنے ملک میں ایک متحرک، فعال اور متعلق بائیں بازو کی تشکیل کیلئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے بین الاقوامی، علاقائی اور مقامی سطح پر موجود ٹھوس حقائق سے آگاہی حاصل کی جائے اور اسکی درست تفہیم کو یقینی بنایا جائے خواہ یہ حقائق ہمیں پسند ہوں یا ناپسند، بین الاقوامی سیاست کی تجسیم یک رخی دنیا سے کثیر المراکز دنیا کی طرف پیش قدمی سے عبارت ہے۔ یہی آج کے عہد میں بین الاقوامی معاشرے کا بنیادی تضاد ہے۔ یہی سامراج اور دنیا بھر کے عوام کے درمیان تضاد کی آج کی مخصوص صورت ہے۔

مشرق وسطیٰ میں جاری قتل وغارت گری اور بین الاقوامی سطح پر توازن قوت میں تبدیلی کے حوالے سے مشرق وسطیٰ کے امور کی ماہر شرمین نروانی (Shermine Narwani) کا یہ تجزیہ قابل غور ہے۔

"No it is not a battle between shia and sunni, Iranian and Arab or the much , ballyhooed Iran Saudi stand off. Yes these naratives have played a part in dafining sides. This is not just a regional fight. It is a global one with ramifications that go well beyond the middle east. It is a war between a colonial past and post-colonicl future, between neo-colonial axis and the post colonial axis. The former seeks to maintain the status quo, the latter strives to shrug off old orders and carve out new independent directions."

دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکی قیادت میں قائم ہونے والا عالمی نظام روبہ زوال ہے ۔ امریکی اپنے زیادہ سے زیادہ مفادات کو تحفظ دینے کیلئے انسانیت پر آخری خوں آشام حملے کررہا ہے امریکی محکمہ دفاع پینٹا گون نے ایک تحقیقی رپورٹ میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ امریکہ ایک سپر طاقت کے طور پر اپنی برتری کھوتا جارہا ہے۔تاہم پینٹا گون اس کا حل فوجی قوت کو وسعت دینے حساس مقامات پر جارحانہ کارروائیوں میں اضافہ کرنے کو ہی ٹھہراتا ہے۔

پینٹا گون کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ

" The US backed international order established after world war II is "fraying" and may even be" collapsing" leading the united states to lose its position of "Primacy" in world affairs.

3۔کثیر المراکز دنیا کے قیام کے لئے نئی ابھرنے والی قوتیں کوشاں ہیں چین اور روس چین محور کو قائدانہ کردار حاصل ہے۔

4۔ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ترقی پذیر ممالک کم از کم دوصدی بعد نئی بیداری کا مظاہرہ کررہے ہیں ۔ایشیا بین الاقوامی سامراج کے خلاف نئی کروٹ لے رہا ہے۔

5۔ سامراج کی کاسہ لیسی میں تباہ شدہ پاکستانی معیشت نئے ماحول سے استفادہ کرنے اور اپنی سانسیں بحال کرنے کی کوششیں کررہی ہے تاہم رجعتی حکمران طبقہ اب بھی کسی ممکنہ تبدیلی کو مزاحمت کرنے میں پرجوش ہے۔

6۔ ملکی سطح پر تمام رجعتی اور انتہا پسند قوتوں کو امریکی سامراج کی سرپرستی حاصل ہے وہ اپنے تمام پرانے اتحادیوں اور نیو لبر لزم (Neoliberalism) کے نئے دوستوں کو متحد کرکے علاقائی قوتوں کے خلاف ایک بار پھر پاکستان کو میدان کارزار بنانے پر تلا ہوا ہے۔

7۔ ملکی صورتحال 60 اور 70 کی دہائیوں کے مقابلے میں زیادہ خطرناک زیادہ پیچیدہ ہے۔اور اس وقت کے مقابلہ میں زیادہ احتیاط اور نظم وضبط کا تقاضہ کرتی ہے ۔آج لینسٹ طرز کی تنظیم کاری ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ متعلق ہے۔

8۔ 50،60،70 کی دہائی میں ریاست اور اس کے اداروں سے مقابلہ کرنا تھا اب ان کے مقابلے میں کہیں وحشت ناک اور بربریت کی حامل غیر ریاستی قوتوں کا بھی سامنا ہے ۔اس پیچیدہ صورتحال کو سامنے رکھ کر تنظیم کی ساخت اور حکمت عملی کے بارے میں فیصلے کئے جاسکتے ہیں البتہ عوامی سیاست اور قانونی طریقوں سے استفادہ کرنے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا،

9۔ اس بارے میں دورائے نہیں کہ ریاستی اداروں خاص طور سے عسکری قوتوں کی بالادستی روز بروز مضبوط سے مضبوط تر ہورہی ہے۔اور پاکستان کی مسلح افواج کو اب زندگی کے ہر شعبے میں بالادستی حاصل ہوچکی ہے جس کی ذمہ داری روایتی سیاسی جماعتوں خاص طور سے مسلم لیگ ن اور پیپلز پارٹی پر عائد ہوتی ہے۔تاہم اس صورتحال کو نعرہ بازی یا پاپولر سیاسی ہم جوئی کے ذریعے تبدیلی کرنے کا اب کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

10۔ سامراج پر انحصار اور عالمی مالیاتی امداد پر چلنے والی معیشت دیوالیہ ہوچکی ہے۔انتہا پسندی اور دہشت گردی نے ریاست کی ساکھ کو خاک میں ملادیا ہے۔تنہائی کا شکار اس ناکام ریاست کو اب امریکہ بھی سہارا دینے کی پوزیشن میں نہیں۔

11۔ امریکہ کی قیادت میں سامراجی قوتیں پاکستان کو عدم استحکام اور انتشار کا شکار کرنے کے درپے ہیں ۔ بھارتی توسیع پسند بھی ہمیشہ کی طرح صورتحال کا فائدہ اٹھا کر اپنی بالادستی قائم کرنے کیلئے کوشاں ہیں۔

12۔ پاکستان میں بائیں بازو کی تنظیم قائم کرنے کی چند سنجیدہ کوششیں ضرور

کی گئیں جو بوجوہ بارآور نہ ہوسکیں۔طویل وقفے کے بعد بائیں بازو کو از سرنو منظّم کرنے کی کوشش ایک بار پھر کی جارہی ہے تاہم بہت سے عملی اور نظری مسائل حل طلب ہیں۔

13۔ عوامی ورکرز پارٹی نے اپنے دوسری قومی کانگریس میں سماجی تبدیل اور اس کیلئے انقلابی پارٹی کی تعمیر کا درست اور سائنٹفک ٹاسک اختیار کیا۔تاہم اس سلسلہ میں ٹھوس پیش رفت اب بھی باقی ہے۔

14۔ انقلابی تنظیم کی تعمیر عرق ریز کا کام ہے اس سلسلہ میں ہر قسم کی مصلحتوں سے کنارہ کرنا ہوگا۔

15۔ مستقبل کی کسی سیاسی حکمت عملی کا تعین کرتے ہوئے نکات نمبر 7،8اور 9 کو مکمل طور پر ذہن میں رکھنا ہوگا۔

نظریاتی ارتقا (Idiological Development)

16۔ پاکستان میں بائیں بازو کی تاریخ کا آغاز بھارتی کمیونسٹ پارٹی (CPI) سے ہوتا ہے۔ بلکہ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی تشکیل (CPI) کے کلکتہ اجلاس میں ہوئی۔ پارٹی کا سربراہ CPI کی قیادت نے ہی تعینات کیا۔منطقی طور پر روز اول سے پارٹی میں دم چھلہ پن (TAILISM) کا رجحان غالب رہا۔

17۔ طبقاتی لائن کی ناپیدی نے تمام معاملات کو عملی حقائق کے بجائے نظری بنیادوں پر دیکھنے کی روش عام کی۔تلنگانہ تحریک سے لے کر نکسل باڑی تحریک تک ہر تحریک کو طبقاتی عینک کی بجائے سطحی مظاہرہ اور بورژوا سیاسی مصلحتوں کی نذر کردیا گیا۔

18۔ پاکستان میں ریاست کا سوال ہو، جمہوریت کا مسئلہ ہو، قومی سوال ہو یا عورت کا مسئلہ ہو۔ ہر ایک مسئلہ کو طبقاتی تقسیم سے بالاتر ہو کر دیکھنے کی روایت عام ہوئی۔جدید چین کے بانی کامریڈ ماؤ نے اس بارے میں وضاحت سے کہا ہے کہ۔

"In the final analysis national struggle is a matter of class struggle.Among the whites in the united states it is only the reactionary rulling circles who, oppress the black people.They can in no way represent the orkers,farmers,revolutionary intellectuals and other enlightened persons who comprise the overwhelming majority of the white people"

عورت کے سوال پر ماؤ نے تحریر کیا کہ۔

"Genuine equality between the sexes can only be realized in the process of the socialist transformation of society as a whole" Mao

19۔مغرب کے مقابلے میں مشرق میں ریاست کے بھرپور طبقاتی کردار سے گرامچی بھی انکار نہ کرسکا لیکن پاکستان میں انحراف پسندوں نے اس حد کو عبور کرنے میں بھی کوئی تکلف محسوس نہ کیا۔

اس معاملے میں عالمی سطح پر گرامچی کے موقف میں موجود بعض ابہام نے آگے چل کر انحراف کی شکل اختیار کی۔ایک طبقاتی معاشرے میں ''غیر طبقاتی آویزش'' کے گمراہ کن تصور نے بھیانک انحراف پسندی کو فروغ دیا۔

خود فرینکفرٹ اسکول کے ایک ممتاز دانشور التھوسر (Althusar) کا کہنا ہے کہ

"Gramscie has underestimated the impact of economic factors on the course of history and the effects of structural constraints on individual behaviour,he has also overestimated the capacities of individuals to transform the capitalist system." (Louis Althusser)

اس بیان پر غور کیا جائے تو گرامچی مارکس کی اقتصادی اساس اور بالائی ڈھانچے کی معروف تھیوری کے مقابلے میں ہیگل کی تصوریت پسندی سے قریب ہو کر انحراف پسندی کی راہ ہموار کرتا ہے۔

جدید چین کے بانی اور بین الاقوامی پرولتاریہ کے عظیم استاد ماؤ زے تنگ کے اس بیان کے بعد کہ

"In class society every one lives as a member of a particular class and every kind of thinking,without exception is stamped with the brand of a class."

طبقاتی لائن کے حوالے سے کسی غلط فہمی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

20۔ سابق مشرقی پاکستان کی قیادت آخری وقت تک جاگیردارانہ اور باقیات کے خلاف فیصلہ کن جدوجہد کی اپیل کرتی رہی لیکن ملک کے مغربی حصے میں موجود بائیں بازو کے رہنماؤں نے اسے درخور اعتناء نہ جانا۔

21۔ ملک کے دونوں صوبوں میں ایک کمیونسٹ پارٹی کا نہ ہونا بھی بڑا المیہ ثابت ہوا۔ کسی بھی بڑے مسئلے پر مشترکہ ٹھوس موقف کبھی اختیار نہیں کیا جا سکا۔

22۔ 21ویں انسانی نجات اور ترقی کی راہ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے 20ویں صدی کے اواخر میں جہاں ٹیکنالوجی کا انقلاب برپا ہو رہا تھا۔ انسانی مشاہدے نے تجربے اور مارکسی علم کی ترقی کی روشنی میں پرولتاریہ کے عظیم استاد کامریڈ ماؤ ژے تنگ نے کہا تھا کہ "Seek truth from fact" یہ بنی نوع انسان کی اجتماعی دانش اور تاریخی تجربات کا نچوڑ ہے۔

23۔ 21ویں صدی مارکسزم میں اعتماد کی تازگی اور نسل انسانی کو ایک نئے اور زیادہ ترقی یافتہ عہد میں لے جانے کی صدی ہے۔ مصنوعی ذہانت اور روبوٹ صنعتی انقلاب انسان کو نئی منزلیں عطا کر رہا ہے۔

24۔ بین الاقوامی سطح پر مارکسزم کے ارتقاء کی نوعیت، وسعت اور رنگا رنگی کو جاننے کے لئے کامریڈ لینن کی نئی اقتصادی پالیسی (NEP) ٹیکنالوجی کی ترقی اور انسانی رویے پر اس کے اثرات، انسانی تاریخ کے ارتقاء، نئے انسان کی تخلیق، جدّت کاری اور خاص طور سے روبوٹ صنعتی انقلاب کی تیاریوں کا جائزہ لینے اور بنی نوع انسان کی اجتماعی دانش کا حصّہ بننے کی ضرورت ہے۔ کامریڈ ماؤ کی یہ بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ

"It is dogmatism to approach Marxism from a metaphysical point of view and to regard it as something rigid.It is revisionism to negate the basic principles of Marxism and to negate its universal truth" (Mao)

اس طرح چینی کمیونسٹ نے حال ہی میں کمیونسٹ اور ورکرز پارٹیوں کے 18 بین الاقوامی اجلاس میں مارکس اور مارکسزم کے بارے میں انتہائی متوازن اور سائنٹفک رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا کہ

"Marx's way of viewing things is not doctrine but a method.It does not provide readymade dogmas but criteria for further research and the method for the research"

گمراہ کن پروپیگنڈے کی مزاحمت ضروری ہے

سوویت یونین کا انہدام دنیا بھر کے محنت کش عوام کے لئے ایک المیہ ہے لیکن سوویت انقلاب کو ناکام تجربہ قرار دینے والے یا تو پرلے درجے کے احمق اور حقائق سے نابلد ہیں یا انہی کے ساتھی ہیں جو ہر صورت مارکس اور مارکسزم کو ناکام دیکھنے کی آرزو میں مبتلا ہیں۔

کامریڈ لینن کی قیادت میں بالشویک انقلاب کے نتیجے میں سوویت یونین اور اس کے عوام نے چند دہائیوں میں جو کچھ حاصل کیا دیگر ممالک نے اس کے حصول میں صدیاں لگائیں۔ انقلاب کے بعد پہلا پنج سالہ منصوبہ کامیابی سے مکمل کر گیا۔ 1930 کے وسط میں سوویت یونین دنیا کا واحد ملک تھا جہاں بیروزگاری ختم کی جا چکی تھی۔ سوشلسٹ انقلاب کے بعد ہی یہاں صنعت کو فروغ حاصل ہوا۔

کامریڈ اسٹالن کی قیادت میں 1959 میں ناخواندگی مکمل طور پر ختم کر دی گئی۔ 1961 میں سوویت یونین نے پہلے انسان یوری گیگرین کو خلاء میں بھیجا۔ بالشویک انقلاب کے تسلسل میں ہی چین، ویت نام، شمالی کوریا، کیوبا اور لاؤس کے عوام نے اپنے اپنے ملکوں میں انقلاب برپا کیا۔ اکتوبر انقلاب کے بعد اس کی راہ اختیار کرنے والے ملکوں اور ان کے عوام نے معیشت، صحت، تعلیم اور دیگر شعبوں میں جو ترقی حاصل کی اس کا کوئی دوسرا ملک یا نظام مقابلہ نہیں کر سکتا۔

کیا کیا جائے؟

ضرورت اس بات کی ہے کہ دنیا کہ مختلف علاقوں میں جاری جدوجہد کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے۔ اپنی ماضی کی غلطیوں کی اصلاح کی جائے۔ عالمی سطح پر طے پا جانے والے ان بنیادی اصولوں پر سختی سے کاربند ہوا جائے کہ کسی بھی ملک میں تبدیلی کی تحریک اس ملک کی تاریخ، ثقافت اور عوام کی منفرد ضروریات کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔ پاکستان کے انقلاب کے لئے پاکستانی خصوصیات کا حامل ہونا اولین شرط ہے۔ بائیں بازو کے اکثر دانشور آج نظریئے کے تخلیقی اطلاق کے بارے میں زیادہ گہرا اور واضح شعور رکھتے ہیں جو کسی بھی پارٹی کے اندر یا باہر ہو سکتے ہیں۔ ان دانشور کا اِن پٹ (Input) لیا جانا ضروری ہے۔ اس کے بعد ہی کوئی واضح لائحہ عمل تیار کیا جا سکتا ہے☆☆

عالمی سرمایہ دارانہ بحران: سوشلسٹ تجربات ٹیکنالوجی کے اثرات

قاضی حکیم

ہر نئے نظام پر پرانے نظام کا ایک خول چڑھا ہوتا ہے جس سے وہ کبھی کبھی دیر تک جان نہیں چھڑا پاتا مثلاً سرمایہ داری اور جاگیرداری کے درمیان یورپ میں 250 سال جنگیں لڑی گئیں تب کہیں جا کر سرمایہ داری کامیاب ہوئی سرمایہ داری جاگیرداری سے زیادہ ایک ترقی پسند نظام ہے اور سوشلزم اس کی اگلی منزل لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انقلاب روس 1917 میں ہوا تھا جبکہ اس وقت کا روسی معاشرہ آج کے پاکستانی معاشرے سے بہت زیادہ پیچھے تھا مارکس نے مزدور طبقہ کا نظریہ پیش نہیں کیا بلکہ اس نے انسان کا نظریہ پیش کیا تھا کہ انسان Nature کی طرف سے آنے والے مسائل کا ادراک کر سکے چونکہ اس میں سب سے زیادہ متاثر طبقہ مزدور ہے اس لیے اسے مزدور کا نظریہ کہا گیا اب آتے ہیں واپس انقلاب روس کی طرف تو باوجود اس کے کہ روسی معاشرہ سرمایہ دارانہ معاشرہ نہیں تھا جو کسی بھی سوشلسٹ انقلاب کے لیے ضروری ہوا کرتا ہے۔ لہذا کچھ تو نقصانات بھی ہوئے لیکن اس کے حاصلات بھی بہت ہیں مثلاً 70 سال میں وہ دنیا کی دوسری بڑی اکانومی بن گئی۔

Space کو انہوں نے مسخر کیا میڈیکل میں اور خاص طور پر ہیلتھ کیئر میں دنیا کے نمبر ایک بن گئے۔ 1928ء تک وہ بیروزگاری پر قابو پا چکے تھے لیکن ان سب کے باوجود 1917 کے روس کو سامنے رکھنا ہوگا۔

چین میں جاگیرداری کی گرفت زیادہ سخت تھی لوگ افیون کے عادی تھے' بہت مذہبی تھے اس لیے ماؤ کا نقطہ نظر دیہی تھا انہوں نے کسانوں کو آگے کیا اور کہا کہ ہمارا انقلاب عوامی جمہوری انقلاب ہوگا جبکہ روس میں عوامی جمہوریت ممکن نہ تھی انڈسٹری بھی تھی مزدور طبقہ بھی کچھ نہ کچھ تھا اس لیے وہاں انقلاب کا ہر اول دستہ مزدور قرار پایا اور انقلاب قومی جمہوری انقلاب کہلاتا ہے۔

ویت نام عوامی جمہوریت اور قومی جمہوری انقلاب کا ملغوبہ تھا اس کے علاوہ جرمن نازی کو اصل شکست سویت یونین نے دی تھی کہتے ہیں کہ ہٹلر کو یورپ والے زندہ لے گئے تھے اور وہ ساؤتھ امریکا میں بہت تاخیر سے مرا اس ضمن میں ایک بات بتاتا چلوں کہ خود لینن نے کہا تھا کہ جرمن انقلاب روسی انقلاب سے زیادہ اہم ہے چاہے اس کے لیے ہمیں اپنا انقلاب قربان کرنا پڑے یہ اس لیے کہ جرمن میں انڈسٹری روس سے زیادہ تھیں اور وہاں ماحول ٹھیک تھا۔

دوسری طرف امریکہ یورپ اور سارے سرمایہ دارانہ دنیا کی طرف سے ان کا محاصرہ شروع ہوگیا تاکہ روس ترقی نہ کرے جبکہ روس ساری دنیا میں پیدا ہونے والے انقلابوں کو کامیاب کرانے کے لیے ان کو سپورٹ کر رہا تھا تو یہی چند عوامل تھے جن کی وجہ سے ناکامیاں بھی ہوتیں لیکن اگر Over all دیکھا جائے تو مختصر مدت میں کامیابیاں بھی بہت سمیٹیں مثلاً انکی معیشت ایک منصوبہ بند معیشت تھی۔ سرمایہ دار ممالک میں اگر مزدور کو کچھ مراعات ملی تھیں تو ان ہی کی بدولت تھیں۔ سوشلسٹ کیمپ ایک Piece camp تھا۔

بائی پولر دنیا ہونے کی وجہ سے جنگیں کم تھیں کسی ملک پر اس طرح اگریشن نہیں ہوتا تھا کچھ اندرونی اپریشنل مشنری میں کمیاں تھیں اور کچھ بیرونی حصار جس کی وجہ سے یہ انقلاب وقتی طور پر ناکام رہا لیکن سرمایہ داری بھی تو ڈھائی سو سال بعد کامیاب ہوئی تھی۔

ٹیکنالوجی انقلاب: Robotic ٹیکنالوجی نے سرمایہ داری کے لیے مسئلہ کھڑا کر دیا ہے مثلاً اگر پہلے ایک کارخانے میں 1500 لوگ کام کر رہے تھے تو اب وہاں 50 لوگ ہیں لیکن سرمایہ داری کے ساتھ اس کا حل نہیں کہ یہ باقی 450 لوگ کیا کریں گے ایک مغربی معیشت دان کہتا ہے کہ سرمایہ داری کا بحران زیادہ سنگین ہے اور ہمارے پاس اس کا حل نہیں اس لیے باقی پروڈکٹس بند کر کے اسلحہ بنایا جائے اور پھر ساری دنیا میں بیچا جائے Truman تھیوری یہ ہے کہ جہاں امریکی مفاد کو خطرہ ہو تو یہ امریکہ کا حق ہے کہ وہ وہاں پہنچ جائے اور اپنے مفادات کا تحفظ کرے سوشلزم کے زوال (وقتی طور پر) کو کسی نے End of the histry کہا اور کسی نے کہا کہ اب صرف Clash of cvilization ہوگا Clash of Economy نہیں ہوگا لیکن ٹیکنالوجی انقلاب نے ان سارے دعووں کو غلط ثابت کر کے یہ بتایا کہ سرمایہ داری کے پاس موجودہ مسائل کا حل نہیں کارل مارکس نے 1948 میں لکھا تھا کہ سرمایہ داری ایک پروگریسیو نظام ہے لیکن جب یہ Mature ہو جائے گا تو اس میں افراد نہیں قومیں ہلاک ہوں گی۔

21 ویں صدی کے تقاضے۔

کارل مارکس نے کہا تھا کہ تبدیلی کے علاوہ کوئی بھی چیز مستقل نہیں۔

جو آلات انسانوں کے رشتے تبدیل کرے وہ انقلاب ہے۔

ٹیکنالوجی نے طاقت کو مسلز سے لے کر دماغ کی طرف منتقل کر دیا اور پھر رفتہ رفتہ یہ طاقت دماغ سے کمپیوٹر پر منتقل ہوگئی جس سے پیداوار پر اثر پڑا اور یہ ایک ایسی تبدیلی ہے جس کا مارکس نے تجزیہ کیا تھا۔

اس کے علاوہ انفارمیشن ٹیکنالوجی نے ایک بنیادی تبدیلی کی اور ایک نیا سپر اسٹرکچر بن گیا پہلے اخبار آیا پھر ریڈیو اور پھر ٹی وی اور اب سوشل میڈیا۔

اب آتے ہیں اکیسویں صدی کے پرولتاریہ کی طرف۔

اصول یہ ہے کہ جو پروڈکشن کرے اور وہ زائد ہو اور کسی اور کے قبضہ میں چلی جائے تو وہ قدر زائد ہے تو کیا وہ قدر زائد اب ختم ہوگئی ہے اب سرمایہ دار کو وہ مفت کا پیسہ نہیں جاتا۔

دوسری بات یہ ہر زمانے میں ضروریات تعیّشات بدلتی رہتی ہیں مثلاً سائیکل پہلے عیاشی تھی پھر ضرورت بن گئی موٹر سائیکل پہلے عیاشی تھی لیکن اب ضرورت ہے موٹر کار ابھی عیاشی ہے کچھ دن بعد ضرورت ہوگی تو اس وجہ سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ پرولتاریہ نہیں رہا پرولتاریہ اب بھی ہے لیکن ٹیکنالوجی کی وجہ سے محنت انفرادی سے اجتماعی بن گئی ہے اس دوران جو استحصال ہو رہا ہے فی الحال ہم اس کو محسوس نہیں کر رہے ہیں لیکن اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ استحصال نہیں ہو رہا لیکن ایک بات طے ہے کہ ہر ترقی میں لوٹ کے خلاف حل اس کے اپنے جسم میں موجود ہوتا ہے۔لیکن اس کے لیے ریسرچ کی ضرورت ہے۔

Law of Negation: ہر نظام پرانے نظام کی بنیادوں پر بنتا ہے پہلے یہ مثبت ہوتا ہے پھر اس کی نفی بھی آ جاتی ہے یہ ارتقاء کا اصول ہے ایک انقلابی لوگوں کو نفی کے بارے میں سمجھاتا ہے اور اسے پوزیٹیو بنانے کی کوشش کرتا ہے اور ترقی کی رفتار تیز تر کر دیتا ہے۔

اکیسویں صدی کے سوشلزم کے لیے Basic princple وہی ہوں گے جو کارل مارکس نے بتائے ہیں لیکن ٹیکنالوجی کی وجہ سے اب دنیا معاشی طور پر ایک State less دنیا بن چکی ہے سرمایہ داری کی شکل تبدیلی ہوتی جا رہی ہے لہذا ان حالات میں ایک انقلابی کا فرض بنتا ہے کہ نئے حالات کا ادراک کرے۔سیاست میں یہ پہچان کرے کہ انفرادی مفاد کیا ہے اور ایک طبقے کے مفاد کی پہچان کیا ہے۔

ہمارا ایک Permenent پروگرام ہونا چاہیے جو کہ سوشلزم ہے لیکن ایک Interem (عبوری) پروگرام بھی ہو جس کے لیے ضروری ہے کہ موجودہ چیلنجوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایک طریقہ کار طے کیا جائے لہذا ہم نئے دور کے ایک جدید سوشلزم کی طرف جائیں جو ٹیکنالوجی کی وجہ سے زیادہ Pure شکل میں ہوگا۔

نیو لبرلزم

وہ سماجی آزادی ہے جو لوگوں کو صنف، قوم، مذہب، نسل سے بالاتر ہو کر ملتی ہے اور یہ سرمایہ دار کی مجبوری ہوتی ہے کیونکہ وہ جاگیرداری ضابطوں کو لاگو کرنے سے تو رہا۔

جب سرمایہ داری ایک خاص اسٹیج پر پہنچی تو Law of Negation کی وجہ سے کچھ سوالات اٹھے سوشل سیکوریٹی، فری تعلیم، فری علاج اور دوسرے incentive جو انہوں نے سوشلزم کے ڈر سے دے دیے تھے وہ بوجھ بنتے گئے اولڈ ایج بنی فیٹ، ویلفیئر اسٹیٹ، کا تصور ان پر گراں گزرنے لگا۔تھیچر نے ایک نظریہ دیا کہ آزادی تو ٹھیک ہے لیکن زیادہ حق ان کا بنتا ہے جو ترقی دے رہے ہیں مثلاً سرمایہ دار۔ لہذا جو ہم incentive دے رہے ہیں ان کی Limatation ضرور ہونی چاہیے اس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ سرکاری اداروں کو بھی نجی ملکیت میں دیا جانے لگا ٹریڈ یونین پر پابندیاں لگنی شروع ہوگئیں انہوں نے کہا کہ لوگوں پر خرچ کرنے کی جگہ سرمایہ کے بحرانوں کو حل کیا جائے ملٹی نیشنلز کے لیے راستہ ہموار کیا گیا اور سرمایہ کو ملکوں کی باؤنڈریز سے نکال کر دنیا میں پھیلا دیا گیا اور دنیا عملاً ایک State less میں تبدیل ہوگئی

عالمی سرمایہ داری بحران:۔ اگر ایک نظام وقت کے مطابق Change ہو تو بحران نہیں آتے۔سوشلزم اور سرمایہ داری میں بنیادی فرق یہی ہے کہ سرمایہ منافع کی بنیاد پر ہوتا ہے جبکہ سوشلزم میں پیداوار ضرورت کی بنیاد پر ہوتی ہے۔سرمایہ دار نے یہ سوچا کہ پہلے اپنا کاسہ بھر لے اور اس کے بعد اس سے جو قطرے گریں گے تو لوگ اسی پر گزارہ کر لیں گے یعنی Trickle down economy کا تصور اس پالیسی نے سرمایہ داری کو ایک بحران میں دھکیل دیا اس بحران سے نکلنے کے لیے انہوں نے رئیل اسٹیٹ کو آسمان پر پہنچا دیا مڈل کلاس کرش ہونا شروع ہوئی لوگوں سے مراعات واپس لینا شروع کیں جس کے نتیجے میں لوگ سڑکوں پر آ گئے ۲۰۰۸ میں جو کچھ ہوا یہ ان کارناموں کا نتیجہ تھا سیرندہ جرمی کوربن، برنی سینڈرز جیسے فیکٹرز یورپ اور امریکہ میں نمودار ہونے لگے یہ بحران کارل مارکس کے نظریہ کے عین مطابق اب سوشلزم پر منتج ہوگا اس کی ایک مثال Das-capital کی بے پناہ فروخت بھی ہے۔

☆☆☆

رسالہ عوامی جمہوریت کی پچاسویں سالگرہ

شاہ محمد مری

5 جون 1971 کے شمارے کو ہم اِس ملک کی 80 سالہ سیاست کے اب تک کے اہم ترین مسئلے کا سامنا کرتے دیکھتے ہیں۔ یہ ہے: قومی مسئلہ۔ یہ اس ملک میں نہایت ہی پرتشدد سیاسی اور نظریاتی معاملہ رہا ہے۔ ایک طرف نیشنلسٹوں میں ایک گروہ ہے جو طبقاتی مسئلہ کی موجودگی کو تسلیم نہ کرتے ہوئے قومی خودمختاری یا آزادی کی بات کرتا ہے، تو دوسری انتہا پر کمیونسٹوں کا ایک دھڑا ہے جو قومی مسئلہ کی ایک الگ معاملے کے بطور موجودگی تک کو مسترد کرتا ہے۔

یہاں عوامی جمہوریت سامنے آتا ہے۔

رسالہ بجائے اپنی بات کرنے کے، اس معاملے پر مارکسزم کے بانیوں کی تحریر دے دیتا ہے۔ اس لیے کہ کچھ لوگوں میں یہ بیماری ہوتی ہے کہ وہ اصل ماخذ دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک مستند بات۔

مضمون کا عنوان ہے: کارل مارکس کا ایک خط بنام میر اور واٹ

واضح رہے کہ مارکس نے یہ خط میر اور واٹ کو لندن سے 9 اپریل 1870 کو لکھا تھا۔ رسالے نے لکھا کہ ''کارل مارکس نے تاریخی مادیت کے جو اصول مدون کئے تھے ان کی روشنی میں اُس نے اپنے عہد کی تمام سیاسی تحریکوں کا جائزہ لیا۔ یہ خط اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ اس نظریہ کے بانی نے اس خط میں آئرلینڈ کی آزادی کی تحریک اور اس کے محرکات پر روشنی ڈالی۔ اور قوموں کے حق خودارادیت کے سوال پر اپنے نکتہِ نگاہ کی وضاحت کی ہے''۔

اس خط کی اہمیت جتلانے کے لیے ہفت روزہ عوامی جمہوریت لینن کا حوالہ بھی دیتا ہے جس نے اپنے پمفلٹ ''قوموں کا حق خوداختیاری'' میں لکھا:

''کارل مارکس اور اینگلز کی پالیسی جو انہوں نے آئرلینڈ کی قومی آزادی کے بارے میں اختیار کی تھی وہ ایک قابلِ ذکر مثال مہیا کرتی ہے۔ اور آج بھی اس پالیسی کی بہت بڑی عملی اہمیت ہے کہ غالب قوموں کے مزدور طبقے کو قومی آزادی کی تحریکوں کی طرف کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ اگر آئرلینڈ اور انگلینڈ کے محنت کش مارکس کی وضع کردہ پالیسی کو قبول نہ کرتے اور آئرلینڈ کے حق خوداختیاری کی تحریک کی حمایت نہ کرتے تو وہ بدترین موقعہ پرستی کا اظہار کرتے اور اس طرح وہ اپنے جمہوری اور سوشلسٹ فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی کرتے۔ اور ان کی یہ کوتاہی انگریز رجعت پسندوں اور سرمایہ داروں کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے کے مترادف ہوتی۔

''مارکس اور اینگلز نے انقلابی محنت کشوں کے لیے قومی پالیسی کی لائن اُس وقت وضع کی تھی جب ابھی سرمایہ داری نظام اجارہ داری میں تبدیل نہیں ہوا تھا۔ اور اس لائن کو اس نے اپنے عہد میں واقع ہونے والے واقعات پر درست طور پر منطبق کیا اور اس لائن پر عمل کرتے وقت بین الاقوامی اور قومی حالات کو پیش نظر رکھا۔ سامراجی عہد میں کمیونسٹوں کو ان کے وضع کردہ بنیادی اصولوں کو منطبق کرتے وقت سامراجی عہد کے بدلے ہوئے حالات کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور انہیں اس بات پر بھی توجہ دینی چاہیے کہ محنت کشوں نے ریاستوں پر قبضہ کرنے کے بعد قومیتوں کے سوال کو کس طرح حل کیا ہے۔ قومی آزادی کی تحریک کی طرف ان کا رویہ روز الکسمبرگ کی طرح لاتعلقی کا نہ ہونا چاہیے بلکہ انہیں اس تحریک کی مضبوط اور ثابت قدمی سے حمایت کرنی چاہیے کیونکہ یہ تحریک معروضی طور پر انقلابی ہے اور ان ملکوں میں سامراجی کے خلاف بغاوت کی طرف لے جاتی ہے جو سامراجی کی طاقت اور توانائی کا ذریعہ ہیں''۔

اِن تعارفی لائنوں کے بعد آیئے اُس خط کی طرف جو پاکستان کے حوالے سے بھی ایک اہم ترین سیاسی اور نظریاتی معاملے کے حل میں اہم ترین کردار ادا کرسکتا ہے:

مارکس کا خط

رفیقو! میں نے آئرلینڈ کے سوال پر کئی برس غور کیا ہے۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ برطانوی حکمران طبقہ پر وہ ضرب جو تمام دنیا کے مزدوروں کی تحریک کے لیے فیصلہ کن ہوگی انگلینڈ میں نہیں بلکہ آئرلینڈ میں لگائی جاسکتی ہے۔ میں نے یکم دسمبر 1869 کو پہلی انٹرنیشنل کی جنرل کونسل کی طرف سے فرانسیسی زبان میں ایک سرکلر جاری کیا تھا۔ میں نے یہ سرکلر فرانسیسی زبان میں اس لیے لکھا تھا کیونکہ فرنسیسی اخبارات میں اس کا شائع ہونا جرمن اخبارات سے زیادہ موثر تھا۔ اس سرکلر میں میں نے واضح کیا تھا کہ آئرلینڈ کی قومی آزادی کی جدوجہد سے مزدور طبقے کی آزادی کا کیا تعلق ہے؟۔ اور فرسٹ انٹرنیشنل کی شاخوں کو جتایا تھا کہ وہ آئرلینڈ کی قومی آزادی کے سوال کے بارے میں کیا رویہ اختیار کریں۔

میں اس خط میں اس سرکلر کے اہم نکات مختصر لکھ رہا ہوں۔

انگلینڈ کے جاگیردار طبقے کی اصل طاقت آئرلینڈ سے فراہم ہوتی ہے۔ آئرلینڈ کا استحصال انگلینڈ کے جاگیردار طبقے کو محض مالی دولت ہی مہیا نہیں

کرتا بلکہ اخلاقی قوت بھی مہیا کرتا ہے۔ آئرلینڈ پر انگلینڈ کا غلبہ دراصل اس کے جاگیردار طبقہ کے غلبے کا نام ہے اور آئرلینڈ پر اس غلبے کی وجہ سے انگلینڈ کا جاگیردار طبقہ انگلینڈ کا غالب اور حکمران طبقہ ہے۔

اگر انگریزوں کی فوج اور پولیس آئرلینڈ سے واپس آجائے تو اس کے نکلتے ہی آئرلینڈ میں زرعی انقلاب ہو جائے گا۔ اگر آئرلینڈ میں انگریزوں کے اس جاگیردار طبقے کا تختہ الٹ جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ انگلستان میں بھی اس جاگیردار طبقہ کے اقتدار کا خاتمہ ہو جائے گا اور انگلستان میں مزدور انقلاب کی بھی یہ ہی لازمی شرط ہے۔ آئرلینڈ میں انگریز جاگیردار طبقہ کی تباہی انگلستان میں اس طبقہ کی تباہی کا آسان عمل ہے کیونکہ زمین کا سوال آئرلینڈ میں وہاں کی اکثریت کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اور یہ سوال قومی سوال سے الگ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ آئرلینڈ کے لوگ انگلستان کے لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ جذباتی اور زیادہ انقلابی ہیں۔

جہاں تک انگریز سرمایہ دار طبقے کا تعلق ہے ان کا اور جاگیرداروں کا مفاد اس حد تک مشترک ہے کہ آئرلینڈ کو چراگاہوں میں تبدیل کر دیا جائے اور وہاں بھیڑیں پالی جائیں تاکہ انگلستان کی منڈی کے لیے گوشت اور اُون سستے داموں حاصل ہوتا رہے۔ اس لیے وہ آئرش لوگوں سے زمینیں زبردستی حاصل کر کے انہیں بھیڑوں کے فارموں میں تبدیل کر رہے ہیں۔ اور یہ وہی عمل ہے جو وہ انگلستان اور سکاٹ لینڈ کے کسانوں کو زمین سے بے دخل کر کے پورا کر چکے ہیں، اور اب آئرلینڈ میں بھی کر رہے ہیں۔ ہر انگریز جاگیردار آئرلینڈ سے ہر سال چھ ہزار تا آٹھ ہزار پونڈ سالانہ لگان وصول کر رہا ہے۔ جو اسے لندن میں بیٹھے بٹھائے مل جاتا ہے۔ انگریز سرمایہ دار کا اہم مفاد آئرلینڈ کی حکمرانی سے وابستہ ہے۔ جوں جوں زمینیں بھیڑوں کے فارموں کی صورت اختیار کر رہی ہیں ویسے ویسے آئرلینڈ میں زمین سے بے دخل شدہ کسانوں کی تعداد بڑھتی جاری ہے اور اس طرح سے آئرلینڈ سے انگلستان کی صنعتوں کے لیے بیکار مزدوروں کی کھیپیں انگلستان پہنچ رہی ہیں۔ اور نتیجہ اس سے یہ نکلتا ہے کہ مزدوروں کی اجرتیں گھٹتی چلی جا رہی ہیں۔ اور انگلستان کا مزدور طبقہ غربت، بیکاری اور اخلاقی انحطاط کا شکار بنتا جا رہا ہے۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ انگلستان کی صنعتی اور تجارتی مراکز کی مزدور، آبادی انگریز مزدور اور آئرش مزدوروں میں بٹ گئی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مزدور طبقہ دو مخالف کیمپوں کی شکل اختیار کر رہا ہے۔ ایک عام انگریز مزدور، آئرش مزدور کو اپنا دشمن سمجھتا ہے۔ اور یہ خیال کرتا ہے کہ اُس کے آنے سے اس کے معیار زندگی میں کمی واقع ہوئی ہے۔ آئرش مزدور کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو حکمران قوم کا فرد سمجھتا ہے اور اس طرح آئرلینڈ کے خلاف جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے اپنے اوپر غلبے کو طاقت بخشتا ہے۔ وہ آئرش مزدور کے خلاف مذہبی معاشی اور قومی تعصّبات کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ اس کا رویہ کچھ اس طرح ہے جس طرح کا امریکہ کی سفید فام غریب آبادی کا حبشی غلاموں کی طرف ہے۔ آئرش مزدور بھی اس رویے کی وجہ سے اسی قسم کا رویہ انگریز مزدوروں کی جانب رکھتے ہیں۔ اور وہ انگریز مزدوروں کو بھی ان مظالم کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں جو انگریزوں کا حکمران جاگیردار طبقہ آئرلینڈ میں اختیار کیے ہوئے ہیں۔

آئرش اور انگریز مزدوروں کے ان تعصّبات اور اختلافات کی سرمایہ داروں کے اخبارات، مذہبی مقتدر اور ظریفانہ پرچے اور وہ تمام ذریعے جو حکمران طبقہ کو حاصل ہیں زندہ رکھنے میں کام میں لائے جاتے ہیں۔ انگریز مزدور طبقہ اپنی تنظیم کے باوجود سرمایہ داروں کی ان چالوں کو سمجھنے سے قاصر رہا ہے۔ اس لیے ناکارہ ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سرمایہ دار طبقہ مزدور طبقے کو تقسیم کرنے کے لیے اپنے حربوں سے اثر انداز ہو رہا ہے۔

لیکن یہ خرابی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اس کا اثر سمندر پار بھی جا رہا ہے اور دونوں ملکوں کے مزدوروں کو متحد کرنے کی کوشش کو ناممکن بنا دیا ہے۔ انگلستان سرمایہ داری نظام کا قلعہ ہے اور عالمی منڈی پر اس کی حکمرانی ہے۔ اور یہ ملک فی الحال مزدور انقلاب کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ سرمایہ دار ملکوں میں سے یہی ایک ملک ہے جس میں مزدور انقلاب کے مادی حالات پیدا ہو چکے ہیں۔ اس ملک میں انقلاب کو قریب تر لانے کے لیے ضروری ہے کہ آئرلینڈ جلد از جلد آزاد ہو۔

اس لیے انٹرنیشنل کا ہر جگہ یہ فرض ہے کہ وہ آئرلینڈ کی آزادی کی تحریک کا ساتھ دے اور لندن میں انٹرنیشنل کی مرکزی کونسل کا یہ فرض ہے کہ وہ انگریز مزدوروں میں یہ شعور پیدا کرے کہ آئرلینڈ کی قومی آزادی کا سوال محض انسانی ہمدردی کا سوال نہیں ہے بلکہ ان کی اپنی آزادی کی اولین شرط ہے۔

ہفت روزہ عوامی جمہوریت کا یہ مضمون دل کرتا ہے کہ پاکستان کے اندر حاکم قوم کے مزدوروں کو روزانہ کی بنیاد پر پڑھایا جائے۔ مگر تحریک جب عمومی طور پر ہی بہت کمزور ہو تو سنجیدہ بحثیں ناپید ہوتی چلی جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ سی آر اسلم اور اس کی پارٹی اور اخبار آخر تک اس موقف کو ایک فریضہ کے بطور دُھراتے رہے مگر، ماسوائے بہت ہی باشعور سیاسی ورکرز کے، قوموں کے مسئلے کی جانب وہاں کے عام مزدور کا موقف وہی ہے جو وہاں کے حاکم طبقات کا ہے۔

☆☆☆

کامریڈ امام علی نازش

مسلم شمیم

کامریڈ امام علی نازش میرے لیے ایک شخص کا نام نہیں بلکہ ایک نظریے، تحریک اور آدرش کا نام ہے۔ اُن کی ذات اور شخصیت اُن کی نظریاتی زندگی میں مدغم ہوگئی تھی اور اُن کا ''میں'' معاشرے کے ضمیر کا ترجمان بن کر انقلاب کا نقیب بن گیا تھا۔ میں اُنھیں ذاتی طور پر ۱۹۶۱ء سے جانتا تھا اور گاہے گاہے ان سے رابطہ بھی رہا۔ اُن کے حوالے سے میرے ذاتی تاثرات یہ ہیں کہ وہ فنا فی الانقلاب تھے، وہ انقلاب جو اُن کے لیے ساری زندگی ایک حسین خواب رہا۔ وہ خواب اُنھیں اپنی زندگی سے زیادہ عزیز رہا اور وہ سنگین اور بدترین صورتِ حال میں بھی اُس انقلاب سے نہ تو منحرف ہوئے اور نہ مایوس۔ مارکسزم کی سچائی پر اُن کا ایقان کبھی متزلزل نہیں ہوا۔ سوویت یونین کا انہدام یقیناً اُن کی زندگی کے لیے سب سے بڑا صدمہ تھا، مگر وہ اِس صدمے سے خود منہدم نہیں ہوئے بلکہ سائنسی سوشلزم کی افادیت اور معنویت پر اُن کا یقین پختہ تر ہوا۔ سماج کو تبدیل کرنے کا مارکسی فلسفہ اُنھیں اِس طرح عزیز از جان رہا جیسے پہلے تھا۔ اپنے ملک اور عوام کے لیے نجات کے اِس راستے کے علاوہ کسی دوسرے راستے پر گامزن ہونے کا اُنھیں کبھی خیال بھی نہیں گزرا۔ وہ ایک سچے انقلابی مجاہد تھے۔

اُن کی بنیادی پہچان ایک مارکسسٹ رہنما کی تھی، مگر میں اُنھیں ادب کے حوالے سے بھی جانتا ہوں اور مجھے ان سے بارہا غزلیں سننے کی سعادت حاصل رہی ہے۔ وہ ایک اچھے شاعر تھے اور اگر اُن کی توجہ اِس شعبے میں خاطر خواہ رہتی تو یقیناً وہ ایک نمایاں مقام حاصل کر سکتے تھے کیونکہ شاعری کے لیے جس خلوص، لگن اور یقین و ادراک کی ضرورت پیش آتی ہے، وہ اُن خصوصیات سے کلی طور پر بہرہ ور تھے۔ اُن کی غزلوں میں بھی وہی فکر اور وہی درد تھا جو اُن کی زندگی کا حاصل کہنا چاہیے، یعنی سماج اور انسانیت کے لیے بے پناہ محبت اور بے پایاں خلوص۔ جو تخلیق کار اِس دولت سے مالا مال ہو، اُس کی تخلیق میں اِس کا اظہار کمالِ فن کی ضمانت جاننا چاہیے شاعر نازش امروہوی کو عروسِ انقلاب کی چاہت نے عروسِ غزل کی طرف متوجہ ہونے کی اجازت ہی نہ دی، ورنہ عروسِ غزل سے اُن کا عشق یقیناً رنگ لاتا اور دنیائے ادب ایک نئے مخدوم محی الدین کے آہنگ و آواز سے روشناس ہوتی۔ یہ بات میں بڑے اعتماد سے کہہ رہا ہوں کہ اُن کی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر ہونے کا موقع میسر آتا تو ترقی پسند شاعری میں ایک اہم اضافہ ہوتا، سرزمینِ امروہہ کا علمی و ادبی پس منظر اور عروسِ انقلاب سے اُن کا مجنونانہ عشق یقیناً اپنی معجز نمائی کا مظاہرہ کرتا بشرطیکہ عروسِ شعر سے بھی اُن کا رابطہ اِسی طرح قائم رہتا جس طرح مخدوم محی الدین نے قائم رکھا تھا۔ کسی دوسرے بڑے ترقی پسند شاعر کے حوالے سے گفتگو کرنے کے بجائے میں نے مخدوم محی الدین کا حوالہ دانستہ طور پر دیا ہے، کیونکہ مخدوم محی الدین وہ واحد ترقی پسند شاعر ہیں جنھوں نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے اپنی وابستگی صرف بحیثیتِ شاعر و دانش ور نہیں رکھی، بلکہ وہ اُس کے سرگرم و سربرآوردہ قائدین میں سے تھے۔ اِس ضمن میں کامریڈ نازش کے چاہنے والوں سے درخواست کروں گا کہ اگر اُن کا شعری ورثہ کسی کے پاس محفوظ ہو تو اُسے شائع کرنے کی طرف توجہ دیں۔

ادب سے تخلیقی وابستگی کے علاوہ کامریڈ نازش نے انجمنِ ترقی پسند مصنّفین سے بھی اپنی دلچسپی اور وابستگی قائم رکھی تھی اور اُس کی تنظیمی سرگرمیوں کے سلسلے میں وہ بڑے پُر جوش رہا کرتے تھے۔ انجمنِ ترقی پسند مصنّفین پر پابندی لگنے کے بعد انجمن سے وابستہ قلم کاروں نے مختلف تنظیموں میں انجمن کے کاز کا پرچم بلند رکھا۔ شمالی سندھ میں ادبستان کے فورم سے اِس کاز کے لیے کام ہوتا رہا۔ ویسے سندھی ادبی سنگت تو قیامِ پاکستان سے پہلے قائم ہوگئی تھی جو دراصل انجمنِ ترقی پسند مصنّفین کا دوسرا نام ہے۔ سندھی ادبی سنگت نے ترقی پسند ادبی تحریک کے لیے جو گراں مایاں خدمات اور کارنامے سرانجام دیے، وہ تاریخِ ادب کا قابلِ فخر حصہ اور اثاثہ ہیں۔ کامریڈ نازش سندھی ادب سنگت کے پرچم تلے اینٹی ون یونٹ تحریک کے زبردست حامی اور قصیدہ خواں تھے۔ ادبستان کے بعد ۱۹۶۰ء کی دہائی میں عوامی ادبی انجمن کے قیام کا جب فیصلہ ہوا تو اِس سلسلے میں بھی وہ بڑے فعال رہے تھے اور ڈاکٹر رکن الدین حسان، جو اُن دنوں کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ تھے، اِس باب میں کامریڈ نازش اُن کے ہم نوا اور ہم سفر رہے تھے۔ غرض یہ کہ اُن کی ادبی خدمات بحیثیتِ تخلیق کار اور انجمنِ ترقی پسند تحریک کی رہنمائی، ہر دو اعتبار سے قابلِ قدر ہیں۔ جیسا کہ ابتدائی گفتگو میں عرض کیا تھا کہ کامریڈ امام علی نازش ایک شخص کا نام نہیں بلکہ ایک نظریے، تحریک اور آدرش کا نام ہے اور وہ نظریہ مارکسی نظریہ، وہ تحریک سوشلسٹ انقلاب کی تحریک اور وہ آدرش سوشلسٹ انقلاب ہے۔ اِس حوالے سے صورتِ حال پر اظہارِ خیال بھی بے محل نہیں ہوگا۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے اوائل میں مجھے یاد ہے کہ میں کامریڈ نازش کو رات کے پچھلے پہر بذریعۂ جیپ محترم کامریڈ سوبھو گیان چندانی کے گاؤں بندی، جو موئن جوڈرو کے قریب واقع ہے، لے گیا تھا اور نمازِ فجر سے پہلے وہاں سے واپسی ہوئی تھی۔ فضا میں شہید حسن ناصر کے خون کی بو بسی ہوئی تھی اور حالات کی سنگینی کا جو عالم تھا، وہ اِس ملاقات کے خصوصی اہتمام سے واضح اور ظاہر ہے۔ تقریباً چار دہائیاں گزر جانے کے بعد آج کی صورتِ حال یہ ہے کہ آج کامریڈ نازش کی برسی کے اجتماع میں ہم لوگ ہر سال ۹ مارچ کو جمع ہوتے ہیں اور اُن کی پارٹی اور اُن کے مارکسی نظریے پر علانیہ اور کھلے انداز میں بات چیت کرتے ہیں۔ نہ تو وہ پارٹی جس کے وہ قائد تھے آج انڈر گراؤنڈ ہے اور نہ اِس نظریے کی کتابوں پر کوئی پابندی ہے اور نہ اِس نظریہ و فلسفہ کے اظہار پر کوئی قدغن۔ اِس صورتِ حال کو ہم دوزاویہ ہائے

نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔ ایک زاویۂ نظر یہ سامنے آتا ہے کہ آج وہ پارٹی جو کبھی ESTABLISHMENT کے لیے چیلنج اور خطرناک تھی، اب وہ نہ تو چیلنج رہی ہے اور نہ اُس سے ESTABLISHMENT کو کوئی خطرے کا احساس ہے۔ اِس زاویۂ نظر کی تائید میں یہ حقیقت اور امر واقعہ آسانی سے مسترد نہیں کیا جاسکتا کہ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائی میں یہ پارٹی ملک گیر پیمانے پر محدود افرادی قوت کے باوجود اِتنی موثر آواز رکھتی تھی کہ ایوانِ اقتدار میں اِس کی صدائے بازگشت سنائی دیتی تھی۔ پہلے مارشل لا سے پہلے ملک کی سیاسی زندگی میں اِس پارٹی کا کردار کتنا اہم تھا، اِس سلسلے میں صرف یہ کہنا کافی ہے کہ فروری ۱۹۵۹ء کے مجوزہ عام انتخابات اگر وقوع پذیر ہوجاتے تو اِس ملک کی آج تاریخ مختلف ہوتی، کیونکہ نیشنل عوامی پارٹی اور دیگر بائیں بازو کی پارٹیوں کی کامیابی کے روشن امکانات تھے۔ واضح رہے کہ اُس وقت نیپ گویا کمیونسٹ پارٹی کا متحدہ محاذ تھا۔ اِس ضمن میں ایوانِ اقتدار نے خطرہ محسوس کیا اور بین الاقوامی سامراج کے آشیر باد کے ساتھ مارشل لا کے ذریعے عوامی حلقوں اور عوامی اقتدار پر کامیابی سے شب خون مارا اور یہ سلسلۂ شب خون جاری رہا نیپ کی تشکیل اور کردار میں کامریڈ سوبھوگیان چندانی جیسے اکابر کی خدمات سے کون ناواقف ہے! اِس دور میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان ہر چند کہ انڈر گراؤنڈ تھی مگر ایک پارٹی تھی، نیپ بھی ایک تھی۔ آج کمیونسٹ نظریے اور فلسفے کے دعوے دار کتنے دھڑوں اور ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے ہیں اور نیپ جیسی بائیں بازو کی جماعت کتنی جماعتوں میں منقسم ہوگئی ہے۔ اِس کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو اِس زاویۂ نظر کی تائید ہوجاتی ہے کہ اب وہ پارٹی جو کبھی ESTABLISHMENT کے لیے چیلنج اور خطرہ تھی، اب بے ضرر ہوگئی ہے اور اب کوئی چیلنج اُس سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ اِس زاویۂ نظر پر غور وخوض کرنا کہاں تک مناسب ہے، اِس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔

دوسرا زاویۂ نظر یہ ہے کہ مارکسی فلسفے نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ تاریخ کا سفر ہمیشہ پیش رفت کا سفر رہا ہے رجعت اور واپسی کا نہیں، چنانچہ پاکستان کی تاریخ کا جائزہ بھی اِس زاویے سے لگایا جاسکتا ہے کہ تمام خرابیوں کے باوجود یہ حقیقت میرے پیشِ نظر ہے کہ کبھی جوش، فیض اور جالب اور سوبھوگیان چندانی کے لیے ریڈیو اور ٹی وی کے دروازے بند تھے وہ دروازے اب اُن کے لیے بند نہیں رہے۔ ترقی پسند تحریک کا ذکر اب اِن اداروں کے لیے شجرِ ممنوعہ نہیں رہا۔ مارکسی نظریے اور فلسفے پر کتابوں کی بھی کمی نہیں اور اُن کی دستیابی میں کوئی قانونی رکاوٹ حال نہیں۔ اب اِس نظریے کے حوالے سے لکھنا پڑھنا کوئی خطرناک عمل نہیں رہا۔ اِسے تاریخ کی دین کہنا چاہیے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بائیں بازوں کی پارٹیاں تنظیمی طور پر شکست وریخت سے دوچار ہوئیں اور ٹکڑیوں میں بٹ گئیں، مگر بائیں بازو کی سیاست وقت کے ساتھ آگے بڑھتی رہی۔ ملکی مسائل پر اِس کے صحیح موقف پر تاریخ نے مہرِ تصدیق ثبت کی اور آج دائیں بازو کی سب سے منظّم جماعت بھی عوام کے مسائل کی سیاست کرنے پر مجبور ہوگئی ہے۔ عالمی پیمانے پر سوویت یونین کے انہدام کے بعد کمیونسٹ پارٹیاں شکست وریخت سے دوچار نہیں ہوئیں، بلکہ سوویت یونین کے انہدام کے اسباب وعلل پر غور کرنے کے بعد دنیا کی کمیونسٹ پارٹیوں نے ازسرِنو آغازِ سفر کیا ہے اور وہ نئی حکمتِ عملی کے ساتھ، نئے تناظر میں سرگرمِ عمل ہیں۔ یورپ پر SOCIAL DEMOCRATS تقریباً حاوی ہوچکے ہیں۔ یہ عالمی صورتِ حال ہمارے نقطۂ نظر سے مایوس کن نہیں بلکہ حوصلہ افزا ہے۔

اِس صورتِ حال کے باوجود ہمیں کچھ زمینی حقائق تسلیم کرنا ہوں گے اور خود تنقیدی اور خود احتسابی کے عمل کے ذریعے اُن اسباب وعلل پر غور کرنا ہوگا جو دھرتی پر قائم ہونے والی پہلی سوشلسٹ ریاست کے انہدام میں کارفرما رہے۔ سوویت یونین کے انہدام سے اشتراکیت کے نظریے اور عمل کے حوالے سے ۱۹۹۱ء سے گفتگو اور بحث ومباحثہ ہوتا رہا ہے اور یہ گفتگو اور مباحثہ جاری ہے۔ مغرب یعنی سرمایہ دار دنیا نے سوویت یونین کے انہدام کو اشتراکیت کی ناکامی بلکہ موت قرار دیا ہے۔ اِس نقطۂ نظر سے میرا بنیادی اختلاف ہے۔

کامریڈ امام علی نازش جیسا شروع میں بیان کیا گیا ہے کہ سوویت یونین کا انہدام یقیناً اُن کی زندگی کے لیے سب سے بڑا صدمہ تھا، مگر وہ اِس صدمے سے خود منہدم نہیں ہوئے اور انقلابِ اکتوبر کے آدرش یعنی سائنسی سوشلزم کی افادیت اور معنویت کبھی اُن کے لیے سوالیہ نشان نہیں بنی ۱۹۹۱ء میں سوویت یونین کے انہدام کو اُنھوں نے اشتراکیت اور مارکسی نظریے کا انہدام وزوال نہیں سمجھا۔ اِس نقطۂ نظر اور زاویۂ نگاہ کا میں حامی ہوں۔ میری سوچی سمجھی رائے میں ۱۹۹۱ء میں سوویت یونین کا انہدام اشتراکیت کی موت اور زوال نہیں تھا جیسا کہ مغرب کے ذرائع ابلاغ اور مفکرین دنیا کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ میں اُس مکتبۂ فکر سے اتفاق رکھتا ہوں جو سوویت یونین کے انہدام کو BUREAUCRATIC/SPATE CAPITALISM کا انہدام کہتے ہیں بالفاظِ دیگر وقت کے ساتھ انقلابِ اکتوبر کا آدرش یعنی سائنسی سوشلزم پسِ پشت ہوتا گیا اور سوویت یونین عظیم لینن کی متعین کردہ راہ سے دور ہوتی گئی۔ یہ گمرہی عظیم لینن کی موت کے بعد ہی شروع ہوگئی اور جوزف اسٹالین نے اشتراکیت کو پرولتاریہ کی آمریت کے نام پر مکمل آمریت میں تبدیل کردیا۔ لینن نے جمہوری مرکزیت کی روایت رکھ کر سوویت نظام کو جمہوری عمل سے ہم آہنگ رکھنے کی بنیادیں استوار کی تھیں جسے سرے سے فراموش کر کے سوویت یونین کو ننگی آمریت کی راہ پر گامزن کردیا گیا۔ جوزف اسٹالین نے اپنے مخالفین کے ساتھ جو سلوک اور رویہ رکھا، اُس کا بیان غیر ضروری ہے جس کے نتیجے میں لاکھوں کمیونسٹوں کا قتلِ عام ہوا۔ اِس انقلاب کے اکابر بشمول ٹراٹسکی کا قتل تاریخ کا حصہ بنا۔ جوزف اسٹالین کو سوویت یونین کا معمار کہا جاتا ہے اور اُس کے طویل دورِ حکومت (۱۹۲۴ء۔۱۹۵۲ء) میں اِس میں کلام نہیں کہ غیر معمولی ترقی ہوئی

اور ۱۹۵۰ء کے اوائل میں سوویت یونین ایک سپر پاور بن گئی، مگر ایسی تیز رفتار ترقی کو کسی نظام کے راہِ راست پر گام زن ہونے کا ثبوت نہیں گردانا جا سکتا، کیونکہ جرمنی نے ہٹلر کے مختصر دورِ حکومت (۱۹۳۳ء۔۱۹۴۵ء) میں جو حیرت انگیز ترقی کی تھی اُسے فسطائیت کے برحق نظام ہونے کی دلیل اور ثبوت نہیں مانا جا سکتا۔ میرے نزدیک ۱۹۹۱ء میں ہونے والے تاریخی سانحے یعنی سوویت یونین کے انہدام کے بہت سے اسباب وعلل گنوائے جا سکتے ہیں اور گنوائے جائیں گے، مگر میرے نزدیک سوویت یونین کے نظام کی جمہوریت سے دوری بلکہ محرومی بنیادی سبب ہے۔ جمہوریت کی نفی کے نتیجے میں وہ پارٹی جس کی قیادت عظیم لینن نے کی تھی، پرولتاریہ سمیت عوام سے دور ہوتی گئی۔ پہلے مرحلے میں کمیونسٹ پارٹی عوام کی ترجمان بلکہ مترادف (SYNONYM) بنی، پھر پارٹی کی مرکزی کمیٹی اِس پارٹی کا نفسِ ناطقہ بنی، بعد ازاں مرکزی کمیٹی کا اختیار پولٹ بورو کو منتقل ہوا اور آخرِ کار پولٹ بورو سے اختیارات ایک شخصِ واحد یعنی سکریٹری جنرل کو منتقل ہو گئے، اِس طرح لینن کی پارٹی مکمل طور پر ایک ایسی پارٹی بن گئی جہاں جمہوری عمل اور جمہوری روایت کے لیے کوئی گوشہ ایک خیالِ خام بن گیا۔ ۱۹۲۴ء کے بعد سے ہونے والے پارٹی کے اندر انتخابات ہوں یا ریاستی اداروں کو انتخابات، اِس قسم کے تمام انتخابات کو سب کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن انتخابات نہیں کہا جا سکتا کیونکہ پارٹی کی قیادت پر تنقید پارٹی سے غداری قرار پائی تھی اور اختلافِ رائے کا اظہار سنگین جرم کا مرتکب ہونا ٹھہرا تھا۔ چنانچہ وقت کے ساتھ سوویت ریاست کا سیاسی اقتصادی ڈھانچا سائنسی سوشلزم سے دور ہوتا چلا گیا اور تمام ترقیوں کے باوجود سوویت یونین ۱۹۹۱ء میں ہونے والے تاریخ کے عظیم سانحے کی طرف گام زن ہوتا چلا گیا اور یہ سفر دراصل اشتراکی نظامِ معیشت وسیاست سے ریاستی سرمایہ دارانہ نظام (STATE CAPITALISM) کی طرف منتقل ہونے کا سفر ثابت ہوا۔ سوویت یونین اگر جمہوری اصولوں اور جمہوری عمل کی راہ پر گام زن ہوتا اور اشتراکیت اور جمہوریت ہم رکاب رہتی تو وہ غلط پالیسیاں شفاف اور جمہوری انتخابی عمل میں عوام کے ذریعے مسترد ہو جاتیں جو سوویت نظام کو ریاستی سرمایہ داری کی طرف لے گئیں اور آخرِ کار ۱۹۹۱ء کے تاریخی المیے پر منتج ہوئیں اور تاریخ کے سفر کو ایک زبردست دھچکا لگا۔ اِس کے باوجود میرے نزدیک سوویت یونین کے انہدام کو اشتراکیت کا زوال یا موت قرار دینے والے تاریخی شعور سے محروم ہیں، کیونکہ سوویت یونین کے انہدام سے مارکسی نظریۂ تاریخی مادیت (MATERIALISM-DIALECTICAL & HISTORICAL) کی نفی نہیں ہوتی، کیونکہ ۱۹۹۱ء کے بعد تاریخ کا سفر مراجعت کا سفر نہیں بنا ہے، یہ سفر پیش رفت کا سفر ہے۔ سماج میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور مجموعی طور پر سماج ترقی کی راہ پر گام زن ہے انسانی تہذیب وتمدن کا سفرِ ارتقا جاری وساری ہے۔ انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال پر مبنی نظامِ معیشت وسیاست کی جگہ فلاحی ریاست کا تصور ظہور پذیر ہوا ہے اور دنیا کے بہت سے ممالک میں سرمایہ دارانہ نظام میں ایسی مثبت تبدیلیاں عمل میں لائی گئی ہیں کہ انسان کو بہتر زندگی گزارنے کے مواقع حاصل ہو گئے ہیں اور انسان صدیوں پرانے استحصالی شکنجوں سے آزاد ہو کر آزادی کی فضا میں سانس لینے اور اپنے ضمیر کی آواز بلند کرنے کا استحقاق حاصل کرنے کی طرف گام زن ہے ظلم کے دائرے اور راسخ العقیدگی کے اندھیرے سمٹ رہے ہیں، یعنی انسانی شعور کی پیش رفت کا سفر جاری وساری ہے۔ شعور کے سورج کے مراکز ماضی میں بھی تبدیل ہوتے رہے ہیں اور حال میں بھی تبدیل ہوئے ہیں، مگر انسانی شعور کا سفرِ ارتقا جمود وسکوت کے بھنور میں قید نہیں ہوا ہے انقلاب اور سماجی تبدیلی کی اشکال تبدیلیِ زمان و مکان کے فرق کے ساتھ مختلف روپ میں ظہور پذیر ہو سکتی ہیں، چنانچہ مارکسی فلسفے کی اساس ماضیِ قریب میں قائم ہونے والے مراکزِ شعور وفکر کی تبدیلی سے متاثر نہیں ہوئی۔ ماسکو اور لینن گراڈ کی جگہ اگر نیویارک اور ٹوکیو نے لے لی ہے تو مارکس کی تاریخی جدلیت کی اِس حقیقت سے نفی نہیں ہوتی بلکہ اُس کی سچائی کی تصدیق ہوتی ہے۔ تاریخ کے ارتقائی سفر میں یہ حقیقت ابھر کر سامنے آئی ہے جو بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ آج دنیا کے بیشتر ممالک میں کمیونسٹ پارٹیاں قانونی طور پر کام کرنے کے لیے آزاد ہیں بشمولِ ریاست ہائے متحدہ امریکا، چنانچہ اِس حقیقت کے پیشِ نظر ماضی میں زیرِ زمین کام کرنے والی پارٹیوں کو کھل کر کام کرنے کے مواقع حاصل ہو گئے ہیں اور اُن کی راہ میں قانون کے شکنجے اور بھیانک عقوبت خانے حائل نہیں رہے ہیں۔ اِس تناظر میں عالمی کمیونسٹ تحریک پر نظر ڈالنے کے نتیجے میں متعدد ایسے ممالک سامنے آتے ہیں جن میں بھارت اور نیپال کی مثالیں شامل ہیں۔

ہندوستان جہاں تیسری دنیا میں جمہوریت کی راہ پر گام زن ہونے والے ملکوں میں سب سے نمایاں مقام رکھتا ہے اور ساٹھ سالہ جمہوری عمل کی تاریخ اِس املک میں جمہوری اداروں اور جمہوری روایات کے استحکام کی تاریخ ہے، وہیں دنیا میں سب سے پہلے کمیونسٹ پارٹی کی حکومت بذریعۂ جمہوری انتخاب ۱۹۵۵ء میں کیرالہ میں قائم ہوئی اور وہاں کمیونسٹ پارٹی کی جمہوری روایات کی تاریخ رقم ہوئی ہے اور کمیونسٹ تحریک کو ایک نئے تجربے کا روشن مستقبل نظر آیا۔ اِس جمہوری عمل کے ساتھ ایک سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت وسیاست میں کمیونسٹ تحریک کے لیے نئے امکانات پیدا ہوئے ہیں۔ کیرالہ کے بعد مغربی بنگال میں ایک اور کامیاب تجربہ ہوا اور اِس باب میں اشتراکیت اور جمہوریت کے سفر کا تضاد دور ہوتا دکھائی دیا ہے۔ واضح رہے کہ ہندوستان کا جمہوری نظام سرمایہ دارانہ نظامِ جمہوریت ہے اور مغربی بنگال میں گزشتہ تیس برسوں سے کمیونسٹ پارٹی برسرِ اقتدار ہے اور یہ دورِ اقتدار اِس عرصے میں منعقد ہونے والے انتخابات کے ذریعے عوامی مینڈیٹ (MANDATE) کی تائید اور حمایت پر قائم ہے۔ ماضیِ قریب میں نیپال میں کمیونسٹ پارٹی اپنے ایجنڈے میں صدیوں پرانی بادشاہت کے ادارے کے خاتمے کے منشور کے ساتھ عام انتخابات میں کامیاب وکامران ہوئی اور اِس مینڈیٹ (MANDATE) کے تحت ۲۹ مئی ۲۰۰۸ء کو

نیپال میں دوسو چالیس سالہ دورِ بادشاہت کا خاتمہ عمل میں لایا گیا۔ ۱۹۱۷ء میں رونما ہونے والے انقلابِ اکتوبر سے یہ کتنا مختلف انقلاب ہے! یعنی جمہوری عمل کے وسیلے سے اشتراکی ایجنڈے پر عمل کے ذریعے بادشاہت کا خاتمہ اور ایک جمہوریہ کا قیام۔ نیپال گویا ایک نئے عہدِ تاریخ میں داخل ہوگیا ہے۔ ہندوستان اور نیپال میں جو تجربات تاریخ کا حصہ بنے ہیں، اُن کی روشنی میں عالمی کمیونسٹ تحریک کے لیے نئی راہیں اور نئی حکمتِ عملی اپنانے کی ضرورت پر غور کرنا چاہیے۔ ۱۹۱۷ء کے بعد تاریخ کا قافلہ جہاں پہنچ چکا ہے، میرا خیال یہ ہے کہ اب اشتراکیت کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کسی انقلاب کا راستہ کلیتاً مسدود ہو چکا ہے اور جمہوریت کے راستے اشتراکیت کی منزل تک پہنچنے کی راہیں استوار ہوگئی ہیں۔

اِس تناظر میں پاکستان میں کمیونسٹ تحریک کا جائزہ لیا جانا بے محل نہ ہوگا۔ یہ تاریخ کی دین ہے کہ پاکستان جیسے ملک میں جہاں پچاس کی دہائی میں یہ پارٹی اور اِس سے اتفاق رکھنے والی ادب کی ترقی پسند تحریک غیر قانونی قرار دے گئی تھی اور اِس سے وابستہ سیاسی قائدین اور کارکن داخلِ زنداں کیے گئے تھے، آج وہ پارٹی غیر قانونی نہیں ہے۔ اِس دور سے قبل اِس پارٹی کا وہ سفر جن بھیانک مرحلوں سے گزرا، اِس کا بیان میرا موضوع نہیں، مگر اِس تاریخی حقیقت کا ذکر بے محل نہیں کہ اِس پارٹی کے پہلے سکریٹری جنرل کامریڈ سجاد ظہیر کو نام نہاد راولپنڈی سازش میں ملوث قرار دے کر اُن کو سزا دی گئی اور وہ سزا کاٹنے کے بعد بھارت واپس چلے گئے جو میرے خیال میں اُنھوں نے صحیح فیصلہ کیا تھا۔ کامریڈ سجاد ظہیر کی بھارت واپسی پاکستان میں کمیونسٹ تحریک کے لیے ناسازگار فضا کی منھ بولتی تصویر ہے۔ کامریڈ سجاد ظہیر کی ہندوستان واپسی کے بعد یہ پارٹی کن مشکلات سے دوچار رہی ہوگی، اِس کا اندازہ اِس پارٹی کے دورہ نماؤں کامریڈ حسن ناصر اور کامریڈ نظیر عباسی کو بہیمانہ طور پر موت کے گھاٹ اتار دیے جانے سے لگایا جا سکتا ہے۔ اِس وحشت ناک صورتِ حال کے باوجود یہ پارٹی زندہ رہی، یہ بڑی بات تھی، مگر یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہے کہ پارٹی وقت کے ساتھ SHRINK کرتی چلی گئی اور FACTIONALISM کا شکار ہو کر بے اثر ہوتی چلی گئی اور کبھی عوامی پارٹی کا روپ نہیں دھار سکی۔

میں تفصیل سے گریز کرتا ہوں اور اپنے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں یعنی کامریڈ امام علی نازش کے حوالے سے اظہارِ خیال۔ کامریڈ امام علی نازش نے شہید حسن ناصر کے بعد پارٹی کی قیادت سنبھالی جو بڑا بھیانک دور تھا۔ پارٹی کی ایسے حالات میں ذمہ داری قبول کرنا گویا قید و بند کی صعوبتوں کو دعوت دینا نہیں تھا بلکہ دار و رسن کی آزمایش سے گزارنے کے لیے خود کو پیش کرنا تھا سو کامریڈ امام علی نازش کا اِس راہ میں قدم رکھنا اور دمِ آخر تک پورے اعتماد اور پوری استقامت کے ساتھ ڈٹے رہنا بذاتِ خود ایک بڑا کارنامہ ہے۔ پارٹی اُن کے زیرِ قیادت کتنی فعال ہوئی اور اُس کا دائرۂ عمل اور دائرۂ اثر کتنا پھیلا، اِس پر تھوڑی سی گفتگو بے محل نہ ہوگی۔ کامریڈ امام علی نازش کا دور اِس پارٹی اور تحریک کے لیے کتنا بھیانک تھا، اِس کا بیان ہو چکا ہے۔ یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہونی چاہیے کہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستانی کبھی MASS PARTY نہیں بنی اور خصوصیت کے ساتھ دھرتی کے بیٹے بہت کم اِس کے دائرۂ عمل کا حصہ بنے اور اِس کے دائرۂ اثر کو پھیلانے میں کوئی نمایاں کردار ادا کیا۔ اِس باب میں البتہ ایک نام کامریڈ جام ساقی کا آتا ہے مگر وہ بھی وقت گزرنے کے ساتھ نظریاتی طور پر منحرف نہ ہونے کے باوجود پارٹی کی کارکردگی سے مایوس ہو کر یا تو گوشہ نشین ہو گئے یا کچھ وقت پیپلز پارٹی کے دورِ اقتدار میں شریکِ اقتدار رہے۔

موضوعِ گفتگو کامریڈ امام علی نازش ہیں جو سید سجاد ظہیر اور حسن ناصر کی طرح ہندوستان سے آئے اور اِن کا آبائی تعلق یوپی کے معروف شہر امروہہ سے تھا۔ یہ تینوں بڑی شخصیات ہیں مگر اپنی اپنی خصوصیات اور تاریخی کردار کے اعتبار سے ایک دوسرے کے برابر ہرگز نہ تھیں۔ اِن تینوں کے درمیان قدرِ مشترک اِن کا بھارتی ORIGIN اور اِن کا ELITIST ORIGIN تھا۔ سید سجاد ظہیر کا آبائی تعلق الہ آباد اور لکھنؤ سے تھا اور وہ یوپی کے ایک سربرآوردہ خاندان کے فرد تھے اور جسٹس وزیر حسن کے لاڈلے بیٹے تھے، ناز و نعم میں پلے تھے اور لندن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور برطانیہ میں قیام کے دوران برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی کے رکن بن کر اور بیرسٹری کی ڈگری کے ساتھ ہندوستان لوٹے کچھ روز وکالت کے پیشے سے وابستہ رہے مگر جلد ہی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے رکن بنے اور اُس کے سرکردہ رہ نما کی حیثیت سے ملک گیر شہرت حاصل کی۔ ۱۹۳۶ء میں انجمنِ ترقی پسند مصنّفین کی تنظیم اور تشکیل کا تمام تر سہرا اُن کے سر رہا اور وہ بے شک اردو سمیت ہندوستان کی تمام زبانوں کی سب سے بڑی ادبی تحریک کے محرک اور بانی تھے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان منقسم ہو کر آزاد ہوا تو وہ وہاں پارٹی میں پوری سرگرمی سے اور بھرپور کردار ادا کر رہے تھے، خصوصیت کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ثقافتی شعبے کے انچارج اور پارٹی کے مختلف جرائد سے وابستہ تھے۔ غرض یہ کہ وہ ایک معروف کمیونسٹ رہ نما تھے جن کا تعلق مسلم کمیونٹی سے تھا۔ یہاں یہ بات بے محل نہیں کہ تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان سے کچھ عرصے قبل کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے ہندوستان میں صدیوں سے آباد مسلمان آبادی کے حقِ خود ارادیت کے اصول کو تسلیم کرتے ہوئے تحریکِ پاکستان کی حمایت کی تھی۔ سو جب تقسیمِ ہند عمل میں آئی تو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا پورے برِصغیر کی پارٹی تھی جس کی شاخیں اور مراکزِ عمل اُس خطۂ ارض میں بھی تھے جو پاکستان کے حصے میں آیا، گویا عملاً کمیونسٹ پارٹی کو بھی تقسیم کے مسائل درپیش ہوئے، چنانچہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی ایک کانگرس ۱۹۴۸ء میں کلکتہ میں منعقد ہوئی۔ اِس کانگرس میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی تشکیل کا فیصلہ ہوا۔ اِس کانگرس میں کامریڈ سید جمال الدین بخاری موجود تھے اور اُن کا یہ خیال تھا کہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا قیام پاکستان سے باہر، یعنی ہندوستان کی سرزمین پر ہونا ایک غلط فیصلہ تھا۔ اُن سے لاڑکانہ میں ایک عرصۂ دراز تک میرا رابطہ اور قربتیں رہی تھیں، لہٰذا دورانِ

گفتگو اُنھوں نے اپنے اِس خیال کا بارہا مجھ سے اظہار کیا تھا۔ پھر اِسی کلکتہ کانگرس میں کامریڈ سید سجاد ظہیر کو کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا سکریٹری جنرل نامزد کر کے اُنھیں پاکستان جا کر پارٹی کی تنظیمی ذمہ داری سنبھالنے کا مینڈیٹ (MANDATE) دیا گیا، اِس طرح گویا کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان بقولِ کامریڈ سید جمال الدین بخاری ہندوستان سے EXPORT ہوئی اور اُس کا قائد بھی، خود کامریڈ سید جمال الدین بھی کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان سے وابستہ کر دیے گئے جو بیسویں صدی کی دوسری دہائی سے سندھ میں پہلے ہی سرگرم عمل تھے اور یہیں آباد تھے۔ اِس میں شک نہیں کہ خطۂ پاکستان کے علاقوں میں پارٹی کا تنظیمی ڈھانچا بہت کمزور اور مختصر تھا اور اِس پر بالائے ستم یہ ہوا کہ مغربی پنجاب اور سندھ کے تمام کامریڈ جن کا تعلق مسلم آبادی سے نہ تھا، وہ ہندوستان ہجرت کر گئے سوائے کامریڈ سوبھوگیان چندانی کے جو آج بھی زندہ ہیں اور تمام بائیں بازو کی پارٹیوں کے لیے سرچشمۂ بالیدگی اور رہ نمائی کا دیوتا ہیں۔ نتیجے کے طور پر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے مذکورہ فیصلے کو سرے سے غلط کہنا اور رد کرنا مجھے اپیل نہیں کرتا، مگر یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ سید سجاد ظہیر کا ثقافتی پس منظر اور پیش منظر پاکستان کے خطوں کے ثقافتی پیش منظر اور پس منظر سے یکسر مختلف تھا۔ یہاں کی عوامی زندگی، رسم رواج اور عوام کی نفسیات کا صحیح ادراک کرنا سید سجاد ظہیر کے لیے ممکن نہ تھا، لہٰذا اِس سماج میں اُن کی قیادت کی کامیابی اور حاصلات معجزوں اور کرامات کی دین ہو سکتے تھے، سو نہیں ہوئے۔ یہاں کے بچے کھچے کامریڈوں کو یک جا کر کے اُن کے درمیان سے کسی کامریڈ کو پارٹی کا سکریٹری جنرل منتخب کیا جانا زیادہ بہتر صورت ہوتی اور پارٹی کے یہاں کے مخصوص سماجی حالات میں یہاں کی دھرتی سے رشتے استوار ہوتے اور یہاں کی آب ہوا میں اِس کے اکھوے پھوٹتے اور پروان چڑھتے تو پارٹی وقت کے ساتھ ایک مستحکم اور تناور درخت کی صورت اختیار کرتی۔ کامریڈ حیدر بخش جتوئی، کامریڈ مرزا محمد ابراہیم، کامریڈ چودھری سی۔ آر۔ اسلم اور کامریڈ سوبھوگیان چندانی، یہ وہ شخصیات تھیں جنھیں پارٹی کی قیادت اور تنظیمی ذمہ داری سونپی جا سکتی تھی۔ میرا یہ خیال میری شاعرانہ خوش گمانی پر بھی مبنی ہو سکتا ہے اور خام خیالی پر بھی۔ کامریڈ سید سجاد ظہیر کی عظمتوں کا میں قائل ہوں اور اُن کی نظریہ دانی، ترقی پسند تحریک سمیت اُن کی تخلیقی بڑائی کا بھی معتقد ہوں اور میری ترقی پسند تحریک سے وابستگی کا سب سے بڑا وسیلہ اور سب سے بڑا سرچشمۂ بالیدگی اُن کی ذات اور شخصیت ہے، لہٰذا پاکستان میں رہ کر جو کارکردگی اُنھوں نے دکھائی جو قربانیاں دیں اور جو جد و جہد کی، اُس کا میں معترف ہوں مگر جو ناممکن العمل حاصلات ہو سکتے تھے اُن کے حوالے سے اور کیا کہا جا سکتا ہے! کامریڈ سید سجاد ظہیر راولپنڈی سازش کیس میں ماخوذ ہوئے، سزا کی مدت پوری کرنے کے بعد وہ بھارت لوٹ گئے اور اُس وقت کے وزیرِ اعظم اور عالمی شہرت رکھنے والے رہ نما پنڈت جواہر لال نہرو نے اُنھیں ہندوستان واپس آنے پر اُن کو خوش آمدید کہا اور ہندوستان کی شہریت سے نوازا۔ واضح رہے کہ وہ پہلے بھی پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ مجھے اُن کا ہندوستان واپس جانا اُتنا ہی اچھا لگا جتنا حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی پروفیسر مجنوں گورکھپوری اور علامہ نیازؔ فتح پوری کا پاکستان آنا برا لگا تھا، کیونکہ اِن عظیم شخصیات کا ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ وہاں جو عزت و توقیر حاصل تھی اور جو بلند ترین اعزازات اِن کو دیے گئے، پاکستان آ کر سوائے بے توقیری کے اِن کے حصے میں کیا آیا اور اِن جیسی اعلیٰ مرتبت شخصیات کا ترکِ وطن کرنا ہندوستان کی مسلمان آبادی کے لیے کیا پیغام بنا اور اُن کو کیسی سبکی کا سامنا ہوا ہوگا، اِس کا قیاس کریں تو بقول غالبؔ:

خامہ انگشت بدنداں کہ اِسے کیا لکھیے ناطقہ سر بگریباں کہ اِسے کیا کہیے

پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کی تنظیمی حیثیت اور کارکردگی قابلِ رشک تو درکنار مایوس کن رہی ہے۔ پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں اِس پارٹی سے بالیدگی حاصل کرنے والی مزدور تنظیمیں اور طلبا تنظیمیں ملکی سیاست کو متاثر کرتی تھیں، مگر وقت کے ساتھ یہ تنظیمیں شکست و ریخت سے دوچار ہوئیں اور بے اثر ہوتی چلی گئیں۔ اِس کے باوجود میری رائے میں کمیونسٹ نظریات وقت کے ساتھ افقِ سیاست پر پھیلتے رہے اور ملکی اور قومی مسائل پر کمیونسٹ سوچ کی سچائی وقت کے ساتھ ابھرتی گئی اور سوشلزم کی مقبولیت بڑھتی گئی، چنانچہ نت نئے سابقے اور لاحقے کے ساتھ سوشلزم مختلف ملکوں کی سیاست میں کارفرما ہوتا گیا۔ پاکستان میں متعدد پارٹیوں نے اپنے اپنے انداز اور زاویۂ نگاہ سے سوشلسٹ پروگرام کو اپنے اپنے منشور میں شامل کیا جن میں پاکستان پیپلز پارٹی کی مثال سب سے نمایاں ہے۔ روٹی، کپڑا اور مکان کا خالص سوشلسٹ نعرہ اِس کے منشور اور پارٹی پروگرام کا نمایاں وصف ٹھہرا اور ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں مذہبی جماعتوں کی مخالفت اور کفر کے فتووں کے باوجود یہ مغربی پاکستان کی سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری۔ اِس تاریخی حقیقت سے یہ سبق اخذ کرنا نادرست نہ ہوگا کہ کمیونسٹ سیاست اور کمیونسٹ پروگرام وقت کی ضرورت بن کر قبولیتِ عام حاصل کرتے رہے ہیں۔ دوسری طرف اِس حقیقت کو مان لینے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ مسلم معاشرہ کمیونسٹ اصطلاح کو قبول کرنے لیے مشکل سے آمادہ ہوگا، ہر چند ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کے قیام (۱۹۲۵ء) میں مولانا حسرتؔ موہانی اور مولانا آزاد سبحانی جیسے اکابر علما پیش پیش اور کمیونسٹ پارٹی کے کان پور میں منعقدہ اجلاس کی تنظیمی کمیٹی کے چیرمین اور نائب چیرمین تھے۔ اِس تناظر میں میرے نزدیک کمیونسٹ تحریک سے وابستہ اُن رہ نماؤں کے فیصلے جنھوں نے مزدور کسان پارٹی اور پاکستان ورکرز پارٹی جیسے ناموں سے کمیونسٹ منشور کو عملی جامہ پہنانے کی راہ اپنائی تھی، صحیح اور حقیقت پسندانہ تھے۔ آج نیشنل ورکرز پارٹی جناب عابد حسن منٹو کی قیادت میں اِنھی خطوط پر قائم کر رہی ہے، لہٰذا کمیونسٹ پارٹیوں کے مختلف گروپ اگر FACTIONALISM ترک کر کے اِس پارٹی کو ایک حقیقی پارٹی کا درجہ دیں تو یہ عین اُس خواب کی تعبیر ہوگی جو کامریڈ امام علی نازشؔ کی آنکھوں میں ساری عمر گھر کیے رہا۔

عوامی ورکرز پارٹی کی ملک بھر میں جاری سیاسی سرگرمیوں پر ایک نظر

(ترتیب وتدوین: عابد شکیل فاروقی)

عوامی ورکرز پارٹی حجرہ شاہ مقیم اجلاس منعقدہ ،مورخہ 14 اکتوبر 2018 میں پارٹی کی تشکیل، تنظیم سازی، موجودہ سیاسی صورتحال اور آئیندہ کی حکمت عملی کے بارے میں گفتگو کی گئی، صوبائی جنرل سیکریٹری احتشام اکبر، سیکریٹری تعلیم میر حمزہ ورک، وائس چیئر میں ٹاؤن کمیٹی حجرہ شاہ مقیم اجلاس کے خاص شرکاء تھے

عوامی ورکرز پارٹی کے صدر جناب فانوس گجر نے کہا ہے کہ میرا ہدف پارلیمنٹ نہیں بلکہ وہ تبدیلی ہے، جسمیں ایک مالدار کے ساتھ ساتھ ایک غریب کو بھی تمام بنیادی حقوق فراہم ہوسکیں، یہ بات انہوں نے چڑھ غونڈہ کے مقام پر اپنے خطاب میں کہی ،اس موقع پر ممتاز قانون دان زاکر حسین ایڈوکیٹ ، غفران احمد ایڈوکیٹ، کے علاوہ میزو اللہ خان نے بھی خطاب کیا۔

عوامی ورکر پارٹی بونیر کے زیر اہتمام، ظاہر شاہ ملنگ میں پارٹی اسکول کا انعقاد کیا گیا جس سے زاکر حسین ایڈوکیٹ، غفران احمد ایڈوکیٹ، میزو اللہ خان اور مرکزی صدر جناب فانوس گجر نے خطاب کیا، پارٹی اسکول میں ملکی و بین الاقومی سیاسی معاشی اور طبقاتی موضوعات اور ایک انقلابی پارٹی کی تعمیر پر سیر حاصل گفتگو کی گئی۔

فرنٹئیر کالونی کراچی میں، مزدور آرگنائزنگ کمیٹی کی جانب سے، منعقدہ ایک اجتماع مورخہ 30 ستمبر 2018، میں پارٹی کارکنوں اور مزدوروں کی ایک کثیر تعداد کے علاوہ، عوامی ورکرز پارٹی کے سینئر نائب صدر اور جنرل سیکریٹری ، یوسف مستی خان، اور اختر حسین، صوبائی سیکریٹری مالیات، عابد شکیل فاروقی، عوامی ورکرز پارٹی کراچی کے صدر عثمان بلوچ، عوامی ورکرز پارٹی کراچی کے سابق صدر شاہ نور، اورنگی یونٹ کے مظہر امام نے شرکت کی۔ اورنگی یونٹ کے مظہر امام نے اجتماع کے شرکاء سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ عوامی ورکرز پارٹی ملک کی واحد پارٹی ہے جو مزدوروں کی جدوجہد کی بنیاد پر تشکیل دی گئی، کراچی پارٹی کے صدر عثمان بلوچ نے کہا کہ ہماری جدوجہد شروع ہی سے مزدور طبقے کے اشوز سے جڑی ہوئی ہے، پارٹی کے سیکریٹری جنرل اختر حسین نے کہا کہ ہمیں مزدوروں کے ساتھ ملکر، کسانوں میں شامل ہوکر انکے مسائل کی بنیادوں پر سیاست کرنی ہوگی۔ سینئر نائب صدر یوسف مستی خان نے کہا کہ میں عوامی ورکرز پارٹی کی بات نہیں کرونگا مگر ہم کسی بھی پارٹی میں ہوں ہمیں ورکرز کلاس کے مسائل کی بات کرنی ہوگی۔ اجتماع سے دیگر مقررین نے بھی خطاب کیا جن میں عوامی نیشنل پارٹی کے مقامی رہنما جناب امیر نواب، مزدور رہنما خالد خان، نادر نیازی، شاہ زریں خان بھی شامل تھے، جبکہ پشتو زبان کے مقامی شاعر صابر احمد صابر نے اس موقع پر اپنی اردو اور پشتو شاعری سے شرکاء کو محظوظ کیا۔

عوامی ورکرز پارٹی میں نئی رکنیت سازی کے نتیجے میں کراچی میں دو نئے یونٹوں کا قیام عمل میں لانے کا فیصلہ کیا گیا جس کے لئے کامریڈ خرم علی کی رہائش گاہ گلشن اقبال میں ایک نمائندہ اجلاس کا انعقاد کیا گیا، جسمیں پارٹی میں شامل ہونے والے خرم علی اور انکے ساتھیوں کے علاوہ عوامی ورکرز پارٹی کے صوبائی سیکریٹری مالیات عابد شکیل فاروقی، کراچی پارٹی کے سیکریٹری شفیع شیخ ،سیکریٹری اطلاعات، حسن جاوید، گلشن یونٹ کے صدر اور سیکریٹری خلیل صدیقی، اور امر عزیزی، اور عابدہ علی نے شرکت کی، اجلاس میں دو نئے یونٹس، گلشن یونٹ ،اور فیڈرل بی ایریا کے قیام کی تجویز دی گئی، جبکہ گلستان جوہر کو ایک الگ یونٹ کا درجہ دینے کی تجویز دی گئی، گلشن یونٹ کے لئے کامریڈ وسیم زیدی کو جبکہ فیڈرل بی ایریا کے لئے کامریڈ فہد حسن کو آرگانائزر کی ذمہ داری دی گئی۔

مورخہ 16 اکتوبر 2018، کو پاکستان بھٹہ مزدور فیڈریشن اور پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے رہنماؤں ایک اجلاس لاہور میں منعقد ہوا جسمیں حکومت کے بھٹے بند کرنے کے فیصلے کی سخت الفاظ میں مزمت کی گئی۔

کارل مارکس کی 200 سالہ یوم پیدائش کے موقع پر ایک پروقار تقریب لیڈز میں منعقد ہوئی، جسکی صدارت ممتاز سوشلسٹ رہنما محترمہ لیز پائین نے کی عوامی ورکرز پارٹی کے پرویز فتح، اور برطانیہ کے ممتاز ماہر معیشت ڈاکٹر جوناتھن وائیٹ دیگر مقررین۔ تھے انہوں نے کہا کہ، ہمیں ایک ایسا باعمل انقلابی راستہ اپنانے کی ضرورت ہے جو عوام کو بلا تمیز رنگ و نسل، مذہب، قومیت، زبان اور علاقے کی تقسیم کے اجتماعی بنیادیں فراہم کر سکے۔ دیگر مقررین میں ٹریڈ یونین کونسل کے سابق صدر محمد تاج، باب پرول، خالد سعید قریشی، جینی ٹرنر، ممتاز صحافی اور عوامی ورکرز پارٹی احمد نظامی، محمد ضمیر، لالہ محمد یون، نصرت علی طور، مارک ونیلا ور جان ٹیلر شامل تھے۔

عوامی ورکرز پارٹی ضلع ملتان کا ایک عمومی اجلاس مورخہ 20 اکتوبر 2018 کو، زیر صدارت صبیحہ چوھدری منعقد ہوا، تنظیمی صورتحال، مہنگائی اور دیگر سیاسی حالات پر گفتگو کی گئی، اجلاس میں، صبیحہ چوھدری، فرحت عباس خان، اقبال ملک، کامریڈ یامین، دلاور عباس، رانا اشتیاق، خلیل احمد، کامریڈ شاہینہ، حفیظاں بی بی، نواز یاندہ نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔☆☆

عوامی ورکرز پارٹی بونیر میں پارٹی اسکول کا انعقاد، صدر فانوس گجر، زاکر حسین ایڈوکیٹ، غفران احمد ایڈوکیٹ نے اسکول سے خطاب کیا

سندھ سے آنے والے اے ڈبلیو پی کے ساتھیوں کی، پارٹی کے بانی صدر جناب عابد حسن منٹو کے ساتھ ایک نشست

حیدرآباد میں پروگریسو اسٹوڈینٹ فیڈریشن کے زیر اہتمام ایک تقریب سے AWP کے سیکریٹری جنرل اختر حسین خطاب کر رہے ہیں

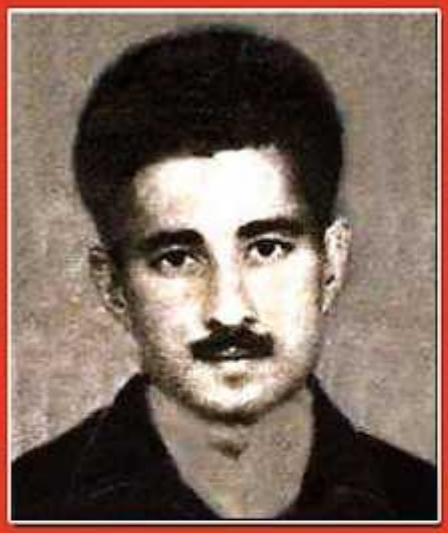

حسن ناصر شہید کی برسی پر

خالد علیگ

شہیدِ قلعۂ لاہور، الوداع کہ میں
بنا رہوں بھلا کب تک ترے لہو کی پکار
میں پوچھتا ہوں، ترے ''بے نمو قبیلے'' میں
ترے سوا بھی کہیں تھی صداقتِ کردار؟

لہو لہو مرے فکر و نظر کی تابانی
لہولہو ہیں مرے حرف وصوت و لفظ و بیاں
لہو لہو مِرا لہجہ، لہو لہو آہنگ
لہو لہو مری نظمیں، لہولہو ہے زباں

میں ایک قرن سے آواز دے رہا ہوں انہیں
مگر یہ لوگ تری برسیاں مناتے رہے
''بڑے خلوص'' سے کرتے رہے ہیں یاد تجھے
''بڑے خلوص'' سے پھر تجھ کو بھول جاتے رہے

ترے رفیق، ترے ہم سفر، ترے عشاق
یہ تیری یاد کا مرقد سجائے بیٹھے ہیں
انہیں یقین ہی نہیں ہے کہ تو، تو زندہ ہے
یہ تجھ کو جنسِ تجارت بنائے بیٹھے ہیں